طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۵۲

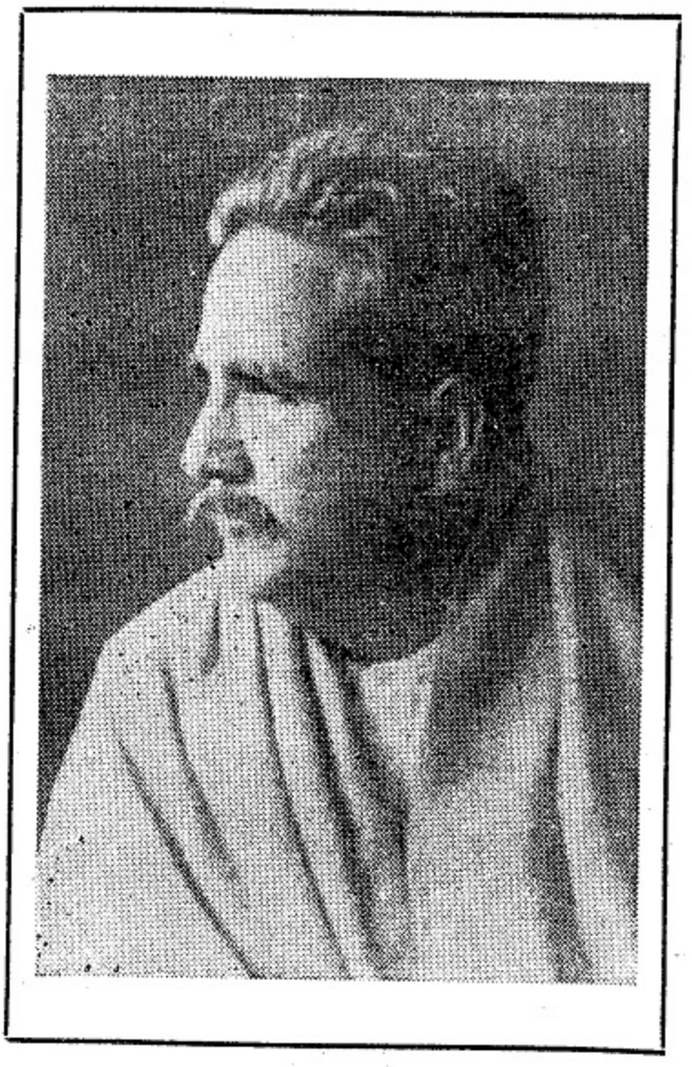

مقالہ خصوصی - اسباب زوال امت

(پرویز)

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپکے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں — ہر قسم کا ہوزری کا سامان۔ ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمر سیٹ سٹریٹ، کراچی

اور پرچون کیلئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگین : ایچ غلام محمد اینڈ برادرز، کراچی

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		" غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵	فروری ۱۹۵۲ء	نمبر ۲

فہرستِ مضامین

لمعات	۴-۱۰
اسبابِ زوالِ امت	۱۱-۵۸
(محترم پرویز صاحب)	
نقد و نظر	۵۹-۶۶
PRAYER FOR PROGRESS	
ربِ اسلام	
احکام الہدیٰ فی حقیقت الہویٰ	
سوشعر	
حقائق و عبر	۶۷-۷۰

مطبوعہ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کچھ عرصے سے اخباری حلقوں میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ کراچی میں ایک بین الاسلامی علماء کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ پچھلے دنوں یہ اطلاع شائع ہوئی کہ مجوزہ کانفرنس کا انعقاد فروری میں ہوگا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا محرک کون ہے۔ اس کا انتظام کس کے سپرد ہے۔ اس کے مصارف کا کون کفیل ہوگا۔ اس سے مقصد کیا ہے؟ یہ سب امور پردۂ اخفا میں ہیں۔ ہر بار صرف اس قدر خبر شائع ہوتی ہے کہ مجلس استقبالیہ کے صدر، ڈاکٹر محمود حسین خان صاحب (وزیر حکومت پاکستان) ہونگے۔ اور بس۔

تشکیل پاکستان کے بعد سے کچھ چیزیں عجیب رازدارانہ طور سے ... (MYSTERIOUSLY) وجود کوش ہوتی چلی آرہی ہیں۔ اس سے پہلے بالعموم ہوتا یہ تھا کہ کوئی کانفرنس منعقد ہونے والی ہوتو اس کے متعلق عام اطلاعات نشر کی جاتی تھیں کہ وہ کانفرنس فلاں انجمن، جماعت یا ادارے کی طرف سے منعقد ہوگی۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہوں گے۔ پھر اس کے اخراجات کیلئے چندے کی اپیلیں شائع ہوتی تھیں۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین سے رکنیت کی فیس وصول کی جاتی تھی۔ خود کانفرنس کے اجلاس میں چندے کی اپیلیں ہوتی تھیں۔ جہاں دیانت ساتھ نہیں چھوڑتی تھی، کانفرنس کے آمد و خرچ کے حسابات شائع ہوتے تھے۔ غرضیکہ جو کچھ ہوتا تھا کھلے بندوں، دن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ دوسرے کاروبار کی طرح کانفرنسوں کے انعقادات بھی "بلیک مارکیٹ" میں ہوتے ہیں۔ اندر ہی اندر سودا پکا ہو جاتا ہے اور باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

پچھلے سال اسی کراچی میں "آل پاکستان علماء" کا ایک اجتماع ہوا جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مختلف فرقوں کے علمائے کرام جمع ہوئے اور انھوں نے دستور پاکستان کے سلسلے میں چند ایک "کلمات طیبہ" ارقام فرما دیئے۔ ان میں سے بعض حضرات ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی پہنچے۔ دوسروں نے ریل کے اعلیٰ درجوں میں سفر کیا۔ اکتیس علماء کی رہائش و خورد و نوش کے جملہ انتظامات ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس پر ہزاروں روپے صرف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن کسی کو آج تک پتہ نہیں چلنے پایا کہ یہ اجتماع کس کی طرف سے ہوا اور کون اس کے اخراجات کا متحمل ہوا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اجتماع کے منتظم ایک مقامی مسجد کے پیش امام تھے۔

اب اس نئی بین المسلمین علماء کانفرنس کے انعقاد کی خبریں افق سے ابھر رہی ہیں اور کسی کو نہیں بتایا جاتا کہ اس مجوزہ ماہِ عالم تاب کا مطلع کونسا "چاہِ نخشب"[1] ہے۔ سب سے بڑی تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ "بلیک مارکیٹ" علماء کے اجتماعات کے سلسلے ہی میں سامنے

---

[1] تاریخ میں ہے کہ ابن مقنع نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور اس کا "معجزہ" یہ تھا کہ اس کے اعلان کے مطابق رات کو آسمان پر پورا چاند نمودار ہو جاتا تھا۔ اس کیلئے اس نے ایک کنواں کھدوا کر اس میں کچھ کیمیائی سامان جمع کر رکھے تھے جن کا عکس آسمان پر پڑتا تھا۔ اس کنوئیں کو چاہ نخشب کہا جاتا تھا۔ نخشب ترکستان کی ایک قدیم بستی کا نام تھا۔

آتی ہے۔ بہرحال چونکہ اس مجوزہ کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں حکومت کے ایک وزیر کا نام بھی منسلک ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کانفرنس کا تعلق ضرور عالم بالا سے ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علما حضرات کی اصل پوزیشن کیا ہے اور ان کے اس قسم کے اجتماع سے حاصل کیا ہوگا؟

لفظ "علماء" عالم کی جمع ہے اور عالم کے معنی ہیں صاحب علم۔ لہٰذا لغوی معانی کے اعتبار سے ہر وہ شخص جو کسی فن کا علم رکھے، عالم ہے۔ لیکن ہمارے ہاں "علم" کا ایک خاص مفہوم ہے۔ اور "عالم" ایک خاص اصطلاح۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ایک مضمون (بہ عنوان قرآنی تصور ملکت) رسالہ معارف میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس میں حضرت طالوت کے تذکرے کے سلسلے میں لکھا کہ قرآن میں ہے کہ اللہ نے انھیں "علم و جسم میں وافر حصہ دیا ہے"۔ جس سے ظاہر ہے کہ "مال و دولت یا حسب و نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی اور بہادری بادشاہ کی اولیں ضرورتیں ہیں"۔ مرتب معارف (سید سلیمان ندوی صاحب) نے لفظ "سیاست دانی" پر نشان دیکر نیچے نوٹ لکھا کہ "قرآنی اصطلاح میں علم کا مفہوم معرفت حق[1] ہے"۔ یعنی انھوں نے فوراً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو متنبہ کر دیا کہ دیکھنا کہیں علم کے مفہوم کو وسعت دیکر سیاست مدن اور اشیائے فطرت کے علوم کے ماہرین کو "علماء" کی صف میں لاکر کھڑے کر دینے کے "کفر" کے مرتکب نہ ہو جانا۔ لہٰذا مولوی کے نزدیک علم سے مراد ہیں صرف وہ بوسیدہ کتابیں جو اسے پڑھائی (بلکہ رٹائی) جاتی ہیں اور "علماء" سے مراد ہے وہ طبقہ جو اس خاص "علم" کا ماہر ہوتا ہے۔ اس علم کی حقیقت کیا ہوتی ہے جس کی تحصیل کے بعد یہ حضرت "علماء کرام" بن بیٹھتے ہیں اور جس کے دائرے کے باہر ان کے نزدیک جہالت ہی جہالت ہوتی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں، ایک ایسے "عالم" کی زبان سے سنئے جسے یہ حضرات "سرخیل زمرۂ علماء ہند" قرار دے چکے ہیں۔ یعنی ابوالکلام صاحب آزاد (تذکرے میں) لکھتے ہیں:

> مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل و اساس علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحب حکمت کی نظر کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعت اصلیہ اور دین الخالص سے مرکب ہے اور کسقدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت و عجمیت سے؟ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علما علوم الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیئات معاشرت وغیرہ ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔ وان من العلم جھلاً۔

یہ ہے وہ علم جس کی تکمیل کے بعد ہمارے دینی مدارس میں مولویت کی سند ملتی ہے اور یہ ہے وہ سند جس کی بنا پر امت سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے تمام کاروبار (حتیٰ کہ نظم و نسق حکومت بھی) ان "علما" کے سپرد کر دے اور ان کی قیادت و سیادت میں فلاح دارین تصور کرے۔ آپ ذرا ان درسگاہوں کا نصاب اٹھا کر دیکھئے جنھیں ہمارے دینی مدارس کہا جاتا ہے۔ وہ نصاب نہیں، چند قبریں ہوں گی جن میں ہزار برس کی بوسیدہ اور متعفن ہڈیاں، عقیدت و ارادت کے کفن میں لپٹی ہوئی ملیں گی۔ نہ کہیں ندرت فکر، نہ حدت افکار کہ ندرت کا نام ان کے ہاں بدعت ہے اور

---

[1] حالانکہ "معرفت حق" کا لفظ تک بھی سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی قرآن نے خدا کی معرفت کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کا مطالبہ خدا پر ایمان اور اس کے قانون (قرآن) کی اطاعت کا ہے۔ لیکن ملا بیچارے کو کیا خبر کہ قرآن کسے کہتے ہیں اور اس میں کیا لکھا ہے۔

کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت کھلی ہوئی گمراہی ہے) یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف، اور تو اور، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جیسوں کو بھی کرنا پڑ رہا ہے جو خود انہی قبرستانوں کے متولیوں میں سے ہیں۔ وہ، رسالہ ترجمان القرآن (بابت دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء) میں ہندی مسلمانوں کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علومِ اوائل تک محدود تھا ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے چڑھائے جائیں۔ انہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیق، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی ان صدیوں[1] میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

یہ ہے مبلغ علم ان حضرات کا جنہیں "علمائے کرام" کہہ کر علم و دانش کا منہ چڑایا جاتا ہے اور جنہیں تمام اسلامی ممالک سے یکجا اکٹھا کرنے کی تجویز کراچی میں طے پا رہی ہے۔

یہ تو رہا ان حضرات کا علم۔ اب ذرا ان کے عمل کے متعلق بھی، انہی کے سرخیل (ابوالکلام صاحب آزاد) کی زبان سے سن لیجئے۔ وہ تذکرہ میں فرماتے ہیں:

ان کا سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔

ہلاکو خاں کے ہاتھوں برپا شدہ قیامتِ صغریٰ اور اس کے بعد کے نتائج و عواقب کے متعلق لکھا ہے:

تاتاریوں کو سب سے پہلے دعوت حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی پیکار نے دی تھی۔ نومسلم حکمران مذہب و علم سے ناآشنا تھے اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہائے مذاہب کے ہاتھ آ گئی۔ ہر مذہب کے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پا گئے۔ یہی چیز صدہا مفاسد و مصائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علمائے دنیا و فقہائے دولت کا ایک گروہ عظیم پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ الگ روز بروز بڑھنے لگے۔ حتیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی، ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے۔

جو حالت تاتاریوں کی یورش کے بعد پیدا ہوئی تھی، وہی حالت تشکیل پاکستان کے بعد پیدا ہو رہی ہے۔ اس زمانے کے "نومسلم حکمرانوں" کی طرح یہاں بھی برسر اقتدار طبقہ "علوم مذہب" سے ناآشنا ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو ان "علماء و فقہاء" کا محتاج سمجھتا ہے اور یہ علماء و فقہاء اس موقع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ جن مولویوں کو ہندوستان میں کوئی پوچھتا تک نہ تھا، پاکستان میں وہ

---

[1] اس قصے کو سردست رہنے دیجئے کہ یہ جمود و تعطل قریب کی صدیوں سے ہے یا پہلی صدیوں ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ طلوع اسلام۔

اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بایدو شاید۔ یہ کانفرنسیں اور اجتماعات، ارباب اقتدار کے اسی جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) اور علما حضرات کے جذبۂ سلب و نہب (EXPLOITATION) کے مظاہر و غماز ہیں۔ ورنہ جہاں تک امت کی اصلاح و فلاح کا تعلق ہے اس کے متعلق ابوالکلام صاحب آزاد کے ان الفاظ کا دہرا دینا کافی ہے کہ

آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کسی سچائی کی خاطر کچھ نقصانِ جان و مال اٹھالے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ لیکن مدعیان علم و مشیخیت اور زہد فروشانِ سجادۂ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں۔ (تذکرہ)

امت کی خاطر ایثار و قربانی تو ایک طرف، ان کی تو حالت یہ ہے کہ

خدا کے بندوں کو فریب دیتے دیتے اس طائفہ بوالہوس کی جرأتیں یہاں تک بڑھ گئی ہیں کہ عالم سرائر و اخفایا کو بھی دھوکا دینے میں چست و چالاک ہو گئے ہیں۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔ (تذکرہ)

یہ سب کچھ کیا کس مقصد کے لئے؟

شریعت الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لئے آئی تھی، اس کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب اور سلب و نہب کے تمام کاروبار جاری ہو گئے۔ اور دنیا کی تباہی کیلئے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لیکر اس دنیا میں برائی پھیلائی جائے۔ (ایضاً)

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اس باب میں لکھتے ہیں کہ

عام طور پر جو حالت طبقۂ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی۔ ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے۔ کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا۔ اس کے وظیفے کھا کر اس کی منشاء کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیریں کرنا۔ اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا اور اپنے مخدوموں کی خاطر علمائے حق[1] کو دبانے کے لئے مذہب کے ہتھیار استعمال کرنا ان کا شعار تھا۔ (ترجمان القرآن)

جو کچھ تاریخ میں پہلے ہوا وہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ صرف وظیفوں اور تنخواہوں کی شکلیں بدلی ہیں۔ اصل اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ذرا نگاہ دوڑا کر دیکھئے کہ ہمارے علمائے کرام میں سے کتنے ہیں جن کا ذریعۂ معاش معلوم و مشہود ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے بیکاروں کا یہ گروہ ہمیشہ قوم کو آپس میں لڑاتا رہا۔ بقول ابوالکلام صاحب آزاد:

گذشتہ دور میں جو بلائیں ہمارے سروں پر آئیں اسی جماعت کی بدبختی اور نحوست کی راہ سے آئیں۔ بادشاہوں کو یہی لوگ راہ راست سے ہٹا کر گمراہ کرتے تھے۔ بہتر طریقے جو گمراہی کے طریقے ہیں جن لوگوں نے بھی اختیار کئے، انہی لوگوں کی بدولت۔

گذشتہ زمانے میں ان "حضرات" کی نحوست کی راہ سے جو بلائیں امت کے سر پر آئیں، انھیں تو چھوڑیئے۔ ابھی کل تقسیم ہند کی تحریک اور اس کے تعاقب میں ملت اسلامیہ پر کشت و خون، غارت گری و ستم کاری، ہلاکت و بربادی، عزت و ناموس کی تباہی کی جو

---

[1] مودودی صاحب ہمیشہ اپنے اور اپنی جماعت کے اراکین کے لئے استثناء کی راہیں نکال لیتے ہیں۔

قیامت ٹوٹی، اس کی ذمہ دار بھی انہی بدبختوں کی نحوست تھی۔ ساری ملت مطالبۂ پاکستان میں متفق اللسان ایک طرف تھی، اور یہ حضرات علمائے کرام" اس کی مخالفت میں ایڑی سے ڈاڑھی تک کا زور لگانے میں دوسری طرف۔ نیشنلسٹ علماء، امت کو متحدہ قومیت کے دامِ ہمرنگِ زمین کے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے، اپنی سامری فن آقایانِ نامدار کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ اسلامی جماعت کے مزاج شناسانِ خدا و رسول، اس تحریک کو یکسر غیر اسلامی قرار دینے اور بانیٔ تحریک (محمد علی جناحؒ) کو ملاحیاں سنانے میں سب سے پیش پیش تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنھیں ہندو یہ کہہ کر انگریز کے سامنے پیش کرتا تھا کہ دیکھ لو! مطالبۂ پاکستان، مسلمانانِ ہند کا متفقہ مطالبہ نہیں۔ انہی کی مشئومہ مساعی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان ملا تو اس طرح کا لولا، لنگڑا ملا اور اس افراتفری میں ملا جس سے ہر ایک کو نفسا نفسی پڑ گئی۔ جناحؒ ان بدبختوں کی منتیں کرتا رہا کہ اس بچاری قوم کی حالت پر رحم کھاؤ اور اس طرح ان کی ہلاکت سامانیوں کا موجب نہ بنو۔ لیکن یہ اس کے جواب میں اپنی دشنام طرازیوں کی بوچھار کو اور بھی تیز کر دیتے تھے۔ آج وہی "علمائے کرام" ہیں جو نہایت ڈھٹائی سے پاکستان کے مائدہ نعمت کے خصوصی اجارہ دار بن رہے ہیں یا بننے کی فکر کر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ "علمائے کرام" جنھیں کبھی کھلے بندوں اور کبھی بلیک مارکٹی انداز سے یوں سر پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی کوششوں میں حکومت پاکستان کا ہاتھ ہے اور اگر ہے تو کس قدر۔ لیکن اگر یہ کچھ حکومت کے ایما سے ہو رہا ہے تو ہمیں نہایت رنج اور تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ مذہب اور ملوکیت (ملا اور اربابِ حکومت) کا وہی دیرینہ سمجھوتا ہے جس کی رو سے، حکومت، ارباب مذہب کی عیش سامانیوں کی کفیل ہوتی ہے اور ارباب مذہب، ارکانِ حکومت کی نصرت و حفاظت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ اور عوام بیچارے چکی کے ان دو پاٹوں میں پستے رہتے ہیں۔ ہم کئی بار ان صفحات پر لکھ چکے ہیں (اور نہ معلوم ہمیں ابھی کتنی مرتبہ اس جگر خراش حقیقت کو دہرانا ہے) کہ اگر اہلِ پاکستان نے تاریخ کی یادداشتوں سے عبرت حاصل نہ کی اور مملکت کے اقتدار کا کوئی گوشہ (بالواسطہ یا بلاواسطہ) ارباب مذہب کے ہاتھوں میں دیدیا تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پاکستان کی بھی وہی حالت ہو جائے گی جو (مثلاً) آج افغانستان و عراق و حجاز کی ہے جہاں زمامِ اختیارات کا ایک سرا ملّا کے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھئے۔ مُلّائیت (مذہبی پیشوائیت) کا وجود قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن آیا ہی اس لئے تھا کہ انسانیت کو شخصیت پرستی کے ان اطواق و سلاسل سے آزاد کرائے۔ آپ کو عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں کسی مولوی کا نام تک دکھائی نہیں دیگا۔ تاریخ کے صفحات، علامہ ابوبکر صدیقؓ، مولانا عمر فاروقؓ اور مولوی عثمان غنیؓ کے سے انداز تخاطب و تعارف سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ یہ گروہ اس وقت کی پیداوار ہے جب یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت کے اقنوم ثلاثہ، اسلام سے اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے بھیس بدل کر مسلمانوں میں آ گھسے اور انھوں نے پھر سے مذہبی پیشوائیت کی اس لعنت کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا جسے قرآن نے اس طرح دور کیا تھا۔ یہ گروہ اس وقت سے آج تک شجر ملت پر اکاس بیل بن کر مسلط ہے جس سے درخت تو جڑوں تک سے سوکھ چکا ہے لیکن اکاس بیل ہری بھری، پھلتی چلی جا رہی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کو جن کے پاس (خود ان کی اپنی شہادتوں کی رو سے جن کے حوالے اوپر دیئے جا چکے ہیں) نہ علم ہے نہ عمل، اسقدر اہمیت کیوں دی جا رہی ہے؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟

بالآخر کوئی وقت تو ایسا آنا چاہئے جب امت بیچاری کو اس عذاب سے نجات مل سکے۔

حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے آخر گناہگار ہے، کافر نہیں ہے یہ

لیکن اس تمام ہنگامے سے ایک چیز ایسی بھی ہے جو ہمارے لئے قدرے وجہ تسلی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کسی ایک مرکز یا نقطہ پر جمع ہونا ان کی "فطرت" کے خلاف ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان کا وجود ہی تشتت وانتشار اور تحزب وتفرق کا رہین منت ہے۔ اس لئے انھیں ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش خود ان کی تباہی اور رسوائی کا موجب بن جائے گی۔ اس چار سال میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کوئی ایک مسئلہ نہیں جس پر یہ لوگ عملاً متفق ہوگئے ہوں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (بار دیگر) ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں:

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہوگئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں، لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچکر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ..... نفاق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھکر بھی متحد ویک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار والفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤدؑ کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے[1]۔ (تذکرہ ص ۸۴-۸۳)

ہم منتظر ہیں کہ مجوزہ کانفرنس انعقاد پذیر ہو جائے تو دیکھیں کہ ــــ اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

(۲)

آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی کہ البیان (لاہور) کی تازہ اشاعت سے ایک ایسی جگر پاش اطلاع ملی جسے لکھتے وقت دل کا خون آنکھوں میں آرہا ہے۔ قارئین کچھ عرصے سے "اجاب لاہور" کا تذکرہ ان صفحات میں دیکھتے آرہے ہیں۔ یہ وہ احباب ہیں جو طلوع اسلام کے پیش کردہ فکر ومسلک کی نشر واشاعت میں بڑے جذب وانہماک سے کام لے رہے ہیں اور جس قرآنی نہج زندگی کو انھوں نے حق

---

[1] خود اپنے گروہ کے خلاف اس قسم کی دشنام طرازی بھی اسی گروہ کے ایک فرد سے ممکن تھی۔ "غیر مولوی" اس تندی وتیزی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان لوگوں کی باہمی گالیوں کے تماشے دیکھنے ہوں تو ان کے مناظروں اور مباحثوں کے تذکرے تاریخ کی کتابوں میں پڑھئے۔ (طلوع اسلام)

سمجھا ہے اسے اوروں تک پہنچانے میں مصروفِ سعی و عمل ہیں۔ اس حلقۂ احباب کے ایک نہایت مخلص اور گرم جوش رکن میرزا خدا بخش (مکے۔ بی۔ مرزا) تھے۔ خبر ملی ہے کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی پرورش و تربیت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں "حسبنا کتاب اللہ" کی روح پرور صدائیں آج سے بہت پہلے سے فضا میں گونج رہی تھیں۔ انہی آوازوں کا اثر تھا کہ مرزائے مرحوم خالص قرآنی ذوق لیکر پروان چڑھے اور اپنی زندگی کی فرصت کے تمام لمحات کو اسی ذوق کے عام کرنے میں صرف کر دیا۔ کیسا نورانی ہے یہ ذوق اور کس قدر مبارک ہے یہ زندگی! ہم اس حادثۂ جانکاہ میں مرحوم کے متعلقین کے شریکِ غم ہیں اور قرآنی سفرِ زندگی میں ان کے رفقائے کار کی اس حرماں نصیبی پر ہم اندوہ، اور اس دعا میں ان کے ہم نوا کہ

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

---

(۳)

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا، اس پرچے میں محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز و حقیقت کشا مقالہ "اسباب زوالِ امت" ان کی نظرِ ثانی کے بعد، دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مقالہ کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سابقہ اشاعت کے اعلان کے بعد، اس پرچے کی زائد کاپیوں کی فرمائشیں آنی شروع ہو گئیں حتیٰ کہ ایک صاحب نے دو سو کاپیوں کی قیمت پہلے ہی ادا کر دی۔ چنانچہ اندازہ یہ ہے کہ اس پرچے کی جسقدر زائد کاپیاں چھپوائی گئی ہیں وہ بھی جلد ہی نکل جائیں گی۔ لہٰذا اگر آپ اس مقالہ کی عام اشاعت چاہتے ہیں تو اپنے لئے زائد کاپیاں جلدی منگا لیجئے۔ ورنہ بعد میں یہ پرچہ بھی (حسب سابق) ختم ہو جائیگا۔ اس مقالے میں ایسی بنیادی حقیقتیں پیش کی گئی ہیں جن سے ہر سوچنے والے کے قلب و نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب کے دیگر اہم مضامین کو بھی اسی طرح وقتاً فوقتاً دوبارہ شائع کرتے رہیں کہ

ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

ذرا ہنس لیجئے | یوں تو کتابت کی غلطیاں عام طور پر دلچسپ ہوتی ہیں لیکن طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں ایک غلطی بہت ہی پرلطف ہے۔ میر انیس کی رباعی کا یہ مصرع ــــ رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے ــــ اس طرح چھپا ہے

رخصت سے پھر آ کے منہ دکھایا ہے تجھے

کیوں؟ ہے نا پُرلطف!

محترم اسد صاحب فرماتے ہیں کہ "ملا کا بہشت" کے عنوان میں علامہ اقبال کے اس مصرع ــ بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش ــ میں جو تصرف کیا گیا ہے ــ بگو عجمی مسلماں را کہ خوش باش ــ اس میں لفظ "عجمی" نے مصرع میں کسی قدر جھول پیدا کر دی ہے۔ بالکل درست ہے۔ لیکن اس ایک مصرع پر ہی کیا موقوف ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا گوشہ ہے جس میں عجمیت نے جھول نہیں پیدا کی؟

اسبابِ زوالِ اُمت

پرویز

چہ گویمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ، چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیِ محمود
تو آں نۂ کہ مصلےٰ ز کہکشاں می کرد
شراب صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود

[محترم پرویز صاحب کا یہ اہم مقالہ طلوع اسلام بابت جنوری فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اب احباب کے تقاضوں کے پیش نظر اسے صاحب مقالہ کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔

جو احباب اسے اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں ان کے لئے اس کا دوبارہ پڑھنا فائدے سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ صاحب مقالہ نے اس میں بہت سے مجمل مقامات کی توضیح کی ہے اور کئی ایک حواشی کا اضافہ بھی۔

جن احباب نے اس مقالہ کو اس سے پہلے نہیں پڑھا ان سے گزارش ہے کہ وہ اسے ایک عام مضمون سمجھکر سرسری طور پر نہ پڑھ جائیں۔ یہ مقالہ درحقیقت ہماری سیزدہ سالہ تاریخ پر قرآن کی روشنی میں، نہایت عمیق تبصرہ ہے جس میں ملت کے زوال کے اسباب کی تشخیص بڑے غور و فکر سے کی گئی ہے اور اس کے بعد علاج کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے جو ان کے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس مضمون کا ایک ایک فقرہ بڑے غور و فکر کا محتاج ہے۔ طلوع اسلام]

طلوع اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۹ء میں "ایک اہم سوال" کے عنوان سے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جس کی اہمیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ سوال مختصر الفاظ میں یہ تھا کہ دنیا میں مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان کی حالت پست و زبوں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے بعد طلوع اسلام نے یہ لکھا تھا کہ

اب آپ سوچئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصر، حالات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوام عالم کے مقابل میں مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس کے بعد طلوع اسلام نے تمام ارباب فکر و نظر کو دعوت دی تھی کہ وہ وقت کے اس اہم سوال پر غور کریں اور اپنے نتائج فکر و تدبر سے طلوع اسلام کو مطلع فرمائیں تاکہ انھیں طلوع اسلام میں شائع کر کے کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں مختلف گوشوں سے جو کچھ طلوع اسلام میں شائع ہوتا رہا میں بغائر اس کا مطالعہ کرتا رہا کہ سوال زیر غور وہ تھا جس نے خود مجھے ایک عرصے سے طلسم پیچ و تاب بنا رکھا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی صاحب فکر کی طرف سے اس کا کھلا کھلا جواب میرے سامنے آسکے۔ طلوع اسلام میں اس

ضمن میں جو کچھ اس وقت تک شائع ہوا ہے اس کا بیشتر حصہ تو اسی انداز کا تھا کہ چونکہ مسلمانوں نے اپنا مذہب چھوڑ رکھا ہے اسلئے ان کی حالت اس قدر پست و ذلیل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس کے جواب کے متعلق طلوع اسلام نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ

یہ جواب حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے تو غیر مسلم اقوام مغرب نے مذہب کو کب سے باندھ رکھا ہے۔ انھوں نے اس سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام دنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔

پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنھوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا ان کی حالت کونسی اچھی ہے؟

اس دوران میں اکثر حضرات نے براہِ راست مجھ سے اور بعض نے طلوع اسلام کی وساطت سے پوچھا کہ میں اس باب میں کیوں خاموش ہوں؟ استفسارات نے تقاضے اور تقاضوں نے اصرار و تکرار کی صورت اختیار کی۔ میں ان تقاضوں کے جواب میں بھی خاموش تھا اور جب بعض احباب کا اصرار لب کشائی پر مجبور ہی کر دیتا تھا تو اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ

داستانِ او مپرس از من کہ من چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ

یہ نہیں کہ اس سوال کے جواب میں میرے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، یہ سوال ایک عرصے سے خود میرے سامنے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسی سوال پر کیا منحصر ہے۔ میری تو تمام عمر اسی اجمال کی تفصیل ہے کہ

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن اس سوال کے جواب میں جو دشواری میرے گلوگیر ہو رہی تھی وہ یہ خیال تھا کہ میری بصیرتِ فرقانی نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے مسلمان اسے سننے کے لئے ابھی تیار نہیں۔ حضرت علامہ نے کہا تھا کہ

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

فرنگ ان کی نواؤں کی تاب لا سکا یا نہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہنوز مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان نواؤں کی تاب لا سکے جو اس کی صحیح تصویر کو قرآن کے آئینہ میں بے نقاب دیکھ کر ایک قلب حساس سے فغاں بن کر اٹھتی ہیں اور فضا کے سینے کو چیر کر آسمان سے جا ٹکراتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے بڑی الم انگیز اور حدیث ہے بڑی جگر خراش کہ مسلمان اپنی اصلی تصویر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینہ میں اپنی بھیانک شکل دیکھ کر آئینہ توڑ ڈالا تھا، ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتا ہے جو اُسے اس کے حقیقی خط و خال سے آگاہ کرتا ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے، دلّی میں ایک بڈھے باپ کا اکلوتا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ فرطِ غم نے باپ کو پاگل کر دیا۔ وہ رات کو اٹھا اور بیٹے کی لاش کو قبر سے نکال لایا۔ وہ لاش کو سینے سے لگائے پھر رہا تھا۔ جو شخص لاش کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھتا وہ اسے چاقو دکھاتا اور جو اس لاش کو مردہ کہتا وہ اسے پتھر مارتا۔ مسلمان نے بھی چند تصورات و رسوم کی لاشوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ جو شخص ان لاشوں کو اس سے الگ کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے وہ اسے چاقو دکھاتا ہے اور جو انھیں مردہ کہتا ہے وہ اسے پتھر مارتا ہے۔ میں نے عمر بھر اس کی کوشش کی ہے کہ جس انداز سے قرآن کی روشنی نے یہ حقیقت مجھ پر بے نقاب کی ہے کہ جس جسدِ بے جان کو مسلمان محبوب جاں نواز سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے وہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی انداز سے یہ حقیقت دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دوں۔ اس لئے مجھے طلوع اسلام کے پیش کردہ سوال کے متعلق بھی اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں کچھ عرض کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سوال ایسا تھا کہ جس بات تک میں مسلمانوں کو آہستہ آہستہ

بتدریج پہنچانا چاہتا تھا، یہ ایک ہی جست میں انھیں اس منزل کے سامنے لاکھڑا کرنا چاہتا تھا اس لئے میں اس باب میں لب کشائی کیلئے متامل تھا اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں ایک طرف میرا یہ مسلکِ تدریج و اہمال، مزید تربص انتظار اور ضبط و انضباط کا متقاضی تھا اور قدم قدم پر یہ کہہ کر عناں گیر ہو رہا تھا کہ

غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد

وہاں دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ جب میں عام طور پر ان جوابات کو دیکھتا جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو رہے تھے تو اس احساس سے کہ

عرب کہ باز دہد محفل شبانہ کجا ست عجم کہ زندہ کند دورِ عاشقانہ! کجا ست؟
بزیر خرقۂ پیراں سبوچہ ہا خالی است فغاں کہ کس نشناسد مئے جوانہ کجا ست؟

میری بیتابیٔ تمنا، تدریج و اہمال کی "مصلحت کوشیوں" کو بالائے طاق رکھ دینے کے لئے کوندے کی طرح لپکتی تھی اور میں اس کے لئے تیار ہو جاتا تھا کہ جو بات آخر میں جا کر کہنی ہے اسے آج ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ بالآخر

از سینہ تا بچند برآرم فرو برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

میں اسی کشمکش میں تھا کہ بعض قریب ترین احباب (اور ادارۂ طلوعِ اسلام) کا تقاضا اس نقطہ تک آپہنچا کہ جہاں ـــ بیا کہ من سپر انداختم۔ کے سوا کچھ اور چارہ نہیں رہا کرتا۔ یہ ہے اس محفلِ شوق میں میرے سب سے آخر میں پہنچنے کی داستانِ جبر و اختیار یعنی

ایں آہِ جگر سوزے در خلوت صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

اس مقام پر میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں آئندہ سطور میں پیش کروں گا، آپ اس سے متفق ہوں یا نہ لیکن اتنا ضرور کیجئے کہ میری گزارشات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور انھیں مجمرِ جذبات کی شعلہ فشانیوں کی نذر نہ کر دیجئے اور دوسرے یہ کہ ان پر نگاہِ تعمق غور کیجئے کہ ان میں بہت سی باتیں شاید آپ کے سامنے پہلی مرتبہ آئیں اور ان پامال راہوں سے کچھ الگ راستے دکھائیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے چلنے کے خوگر ہو رہے ہیں۔

اور اگر آپ میری تشخیص سے متفق ہوں تو پھر سوچئے کہ اس مزمن مرض کے لئے قرآن نے جو علاج تجویز کیا ہے اسے کس طرح بلا مزید توقف و تربص عملاً شروع کر دیا جائے۔

انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا۔ (۳۴/۴۶)

میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم دو دو ایک ایک کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پھر غور کرو (کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس پر کس طرح عمل کیا جائے)

سوال زیرِ غور کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے جسے بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے، ہر جگہ بلا شک و شبہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے اس دعوے کے اثبات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ابھی اگلے دنوں (شروع دسمبر ۱۹۴۹ء میں) کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک

کانفرنس (بین الملی اعلامی اقتصادی مؤتمر) کا انعقاد ہوا جس میں تمام اسلامی ممالک (یعنی مسلمانوں کی سلطنتوں) کے نمائندے جمع تھے۔ ان نمائندے اس مؤتمر میں شریک تھے) مشترک تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہا:

خطاب کرتے ہوئے محترم غلام محمد صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں ان اقدار و عناصر کو ایک ایک کر کے گنایا جو دنیا کے مسلمانوں میں

چوتھا عنصر جو ہم میں بطور قدر مشترک موجود ہے، کچھ خوش آئند نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم سب پست اقوام ہیں اور ترقی میں پس ماندہ۔ مغرب کے مقابلہ میں، جو صنعت و حرفت میں بڑا ترقی یافتہ ہے۔ ہم نااہل ہیں اور ہمارا معیار زیست بڑا پست ہے بعض اوقات تاسف انگیز حد تک پست۔ اور پانچواں عنصر جو اس سے بھی زیادہ ہماری بدبختی کا آئینہ دار ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ہم سیاسی طور پر کم و بیش آزاد ہیں، اقتصادی طور پر ہم مغربی اقوام کے پنجۂ آہنی کی گرفت میں ہیں۔ . . . . . اور اس سے تو آپ متفق ہوں گے کہ دوسروں کے مفاد، فیصلوں اور قوت کے سامنے اقتصادی زیردستی، آزادی نہیں، آزادی کے فریب اور نقاب میں چھپی ہوئی غلامی ہے اس لئے ہم سب نہ ابھی کامل طور پر آزاد ہی ہیں اور نہ ہی اپنے گھروں کے آپ مالک۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دعوے کے اثبات کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو رہا تھا، اس سے زیادہ کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ اور یوں بھی وہ کونسا دن ہے اور کونسی تقریب، جس میں چار مسلمان اکٹھے ہوں اور اپنی زبوں حالی کی مرثیہ خوانی کرتے دکھائی نہ دیں۔ اپنی حالت پر ماتم یہ تو ہماری زندگی کا معمول ہو رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

عزت و ذلت کسے کہتے ہیں

اب ایک امر تنقیح طلب اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ مسلمان، قوت و ثروت، دولت و حشمت، صنعت و حرفت اور سیاست و مملکت میں غیر مسلموں سے پیچھے اور ان کا آستاں افتادہ ہے۔ اسے ہم نے ان کی نکبت و ذلت سے تعبیر کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزت اور ذلت کا یہ معیار ہی غلط ہے۔ یعنی جن عناصر کا نام تم نے عزت رکھ چھوڑا ہے، اسلام انھیں وجۂ عزت قرار ہی نہیں دیتا۔ لہٰذا جب عزت و ذلت کا معیار ہی غلط ہے تو اس معیار پر مسلمانوں کی حالت کو پرکھنا اور اس پر پورا نہ اترنے پر انھیں پست و ذلیل قرار دینا کب صحیح قرار پا سکتا ہے؟ چنانچہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس اعتراض کا جواب ہی یہ دیا جاتا ہے کہ "عزت سب خدا کے لئے ہے" اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ صاحب عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اور پرہیزگار (متقی) وہ ہے جو دنیا کی آلودگیوں اور خباثتوں سے مجتنب رہے۔ دنیا کا مال و دولت فتنہ ہے۔ انسان جتنا اس فتنے سے دور رہے اتنا ہی خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باخدا وہ ہے جو سب سے زیادہ دنیا سے کنارہ کش ہو۔ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ مومن دنیا میں اس طرح رہتا ہے جس طرح جیل خانہ میں قیدی۔ دنیاوی زیبائش و آرائش اور تحسین و تزئین حرام ہے اور لذائذ و خطائط مکروہات۔ دولت و قوت، فرعونیت کی علامتیں ہیں اور غلبہ و تسلط ابلیسیت کی سرکشی۔ لہٰذا جب یہ مفروضہ ہی غلط ہے (کہ مسلمان ذلیل و خوار ہے) تو اس پر قائم کردہ عمارت بھی از بنیاد تا بام غلط۔

اس موضوع پر میں، اس سے پہلے اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اب کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ دنیا اور اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے یہ باطل تصور "مذہب" کا پیدا کردہ ہے اور "دین" کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے اس لئے اس کے بعض گوشوں کے متعلق کچھ مختصراً عرض کرنا ناگزیر ہے۔

انسان دنیا میں رہتا ہے اور ان قوانین طبیعی کے مطابق جو ہر ذی حیات کے لئے جاری و ساری ہیں، اسے زندہ رہنے کے لئے متاعِ دنیا سے متمتع ہونا ناگزیر ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، دیگر ضروریاتِ زندگی ہر جینے والے کے لئے ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سامانِ زیست

کا محتاجوں اور بھکاریوں کی طرح ملنا سزاوارِ انسانیت ہے یا عزت و تکریم سے حاصل ہونا تقاضائے آدمیت۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے صحیح جواب کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کی عقل کی۔ ہر ذی شعور انسان، بشرطیکہ اس کی عقل پر کورانہ تقلید کے پردے نہ پڑ چکے ہوں اور وہ خود سوچنے کی صلاحیت کھو نہ بیٹھا ہو۔ بلا تامل کہہ دے گا کہ ذلت و رسوائی کی روٹی کے مقابلہ میں عزت و آبرو کا رزق ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس عزت و آبرو کی روٹی کو قرآن "رزق کریم" کہتا ہے اور اسے سچے مومنوں کا حق قرار دیتا ہے۔

والذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اووا ونصروا اولئک ھم المومنون حقاً لھم مغفرۃ ورزق کریم (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روٹی ہے۔

اس کے مقابلہ میں قرآن دوسرے گروہ کا ذکر کرتا ہے (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) جو اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لھم فی الدنیا خزیٌ (۵/۳۳) "ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے"۔ ذلۃٌ فی الحیاۃ الدنیا (۷/۱۵۲) "ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت ہے"۔ وہ دنیا میں سخت عذاب کے دن گزارتے ہیں۔ عذابًا الیمًا فی الدنیا (۹/۷۴) "ان کے لئے دنیا میں المناک سزا ہے"۔ یہ سزا بھوک اور خوف کا عذاب ہے۔ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف (۱۶/۱۱۲) "اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا"۔ یعنی اس دنیا میں سامانِ زیست کا میسر نہ آنا۔ یا میسر آنا تو اس ذلت و خواری سے میسر آنا جس میں ہر وقت بالادست قوتوں کا خوف سر پر سوار رہے۔ قرآن کی رو سے خدا کا عذاب ہے۔ اس کے برعکس طیب اور خوش گوار زندگی کہ جسے خدا کا انعام کہا گیا ہے وہ ہے جس میں ذلت و خواری نہ ہو۔ ولا یرھق وجوھھم قترٌ ولا ذلۃ (۱۰/۲۶) "نہ ان کے لئے روسیاہی ہوگی نہ ذلت و خواری"۔ وہ جنتِ آدم کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لا تجوع فیھا ولا تعرٰی وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحٰی (۲۰/۱۱۸) اس میں نہ بھوک ہے نہ برہنگی۔ نہ پیاس ہے نہ دھوپ، یعنی خوراک، لباس، مکان سب کچھ میسر ہے اور عزت کے ساتھ میسر۔

عزت کی روٹی کیسے ملتی ہے؟

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دنیا میں عزت کی زندگی جس میں سامانِ زیست کی فراوانی ہو اور اس کے لئے کسی بالادست قوت کا خوف دامنگیر نہ ہو، انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی، خدا کا عذاب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں سامانِ زیست اور قوت و ثروت جس سے دوسروں کا خوف باقی نہیں رہتا، حاصل کس طرح سے ہوتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کائنات، طبیعیات کے قانون (Physical Laws) کے مطابق چل رہی ہے اس لئے طبیعی زندگی کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کیلئے طبیعیات کے قانون کی اتباع کرنی ہوگی۔ اس میدان میں ہر انسان برابر ہے۔ مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب دونوں کی طبیعی زندگی ایک ہی قانون کے مطابق چل رہی ہے تو اسبابِ زندگی کے حصول کے لئے قوانین بھی ایک ہی ہوں گے۔ جس طرح ایک غیر مسلم سانس لیکر زندہ رہتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے لئے بھی ہوا وجہِ زیست ہے۔ جس طرح وہ غذا کا محتاج ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ سنکھیا کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ جب ایک یہودیہ نے رسول اللہؐ کے کھانے میں زہر ملایا تھا تو اس زہر کا اثر حضورؐ کے جسم پر اسی طرح ہوا جس طرح کسی اور دوسرے انسان کے جسم پر ہوتا ہے۔ لہٰذا متاعِ حیات اور سامانِ زندگی کے حصول کے لئے ہر انسان کے لئے یکساں قانون ہیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب خدا نے کہا ہے کہ وسخر لکم ما فی السماوات والارض (پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے)۔

تو اس کا مخاطب انسان ہے صرف مسلمان نہیں۔ جو تسخیر فطرت کے لئے جد و جہد کرے گا، فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دیگی۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہیں ہوگی۔ خدا نے آدمی کو "خلیفہ فی الارض" کہا ہے اور آدمی ہی کو علم الاسماء (علم اشیائے فطرت) دیا ہے۔ لہٰذا جو بھی اس علم سے فائدہ اٹھانا چاہے اٹھائے۔ فطرت اس باب میں نہ کسی سے بخل کرے گی نہ کسی کی رعایت۔ اس کے لئے اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم، مومن و کافر سب برابر ہیں۔ مومن و کافر کا فرق متاع فطرت کے استعمال میں جاکر ہوگا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ تسخیر فطرت کی جد و جہد کے نتائج میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ دیکھئے قرآن کس قدر وضاحت سے کہتا ہے کہ

من کان یرید الحیاۃ الدنیا و زینتہا نوف الیہم اعمالہم وہم فیہا لا یبخسون (۱۱/۱۵)

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے ہم اس کی جد و جہد کا پورا پورا ماحصل اسے دنیا میں دیدیتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

تصریحات بالا سے حسب ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے۔

(۱) دنیاوی زندگی میں سامانِ زیست کی فراوانی اور بے خوفی ہی شایانِ شانِ انسانیت ہے۔

(۲) سامانِ زیست تسخیرِ فطرت سے ملتا ہے۔

(۳) فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو ان کے لئے جد و جہد کرے اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

(۴) جو تسخیر فطرت میں جد و جہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۵) اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے حصول میں دوسروں کی محتاجی، لعنت اور ذلت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے۔

دنیا اور آخرت کا مفہوم

اب آگے بڑھیے۔ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں "دنیاوی متاع" کو حقیر کہا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "آخرت" کو عزیز و پائندہ۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے "مذہب" نے سہارا پکڑا اور دنیائے ناثبات کی تمام متاعِ حقیر و ذلیل کو کفار کا حصہ بنا دیا۔ اور آخرت اپنے پیاروں کے لئے مخصوص کرلی۔ لہٰذا قرآن کے ان مقامات کا صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک ایسی بات سامنے آئیگی جو بہت سوں کے لئے شاید بالکل نئی ہو۔ لہٰذا یہ مقام ذرا گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

ؔ قرآن نے آدم کو خلیفہ فی الارض کہا ہے لیکن ہم نے اسے خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھ لیا (یعنی زمین میں خدا کا نائب) جب اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ کیا فرعون و نمرود بھی خلیفۃ اللہ ہوسکتے ہیں تو پھر اس "خلافتِ الٰہیہ" کو مومنین کے لئے مخصوص کر دیا۔ حالانکہ قرآن نے آدم کو کہیں خلیفۃ اللہ فی الارض نہیں کہا۔ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والا (SUCCESSOR) "جانشین" کے ہیں۔ زمین میں آدمی سے پہلے جو نوع آباد تھی، آدمی اس نوع کا جانشین ہے۔ یعنی اس کی جگہ اب یہ آباد ہے۔ یہ ہے مفہوم [illegible] فی الارض کا۔ یعنی زمین میں انواعِ سابقہ کا جانشین۔ نہ کہ اللہ کا نائب۔ اسی آدمی کو اللہ نے علم اسمار فطرت دیا تھا جو اس سے پہلی آبادی کو حاصل نہیں تھا۔ وہ سد [illegible] ارتقا میں اس سے پیچھے تھیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز آگے چل کر آتی ہے جہاں ماحصلِ تسخیرِ فطرت کے استعمال کا سوال آتا ہے۔

خدا کی نیابت کا تصور اس لئے بھی غلط ہے کہ نیابت (TO REPRESENT) ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ اللہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اس لئے اس کی نیابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن، انسان کی پیدائش سے لیکر اس کی طبعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہے اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے کو حیاتِ اخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن (اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے) دنیا اور آخرت کے الفاظ سے قرآن کا فقط یہی مفہوم نہیں۔ وہ ان الفاظ کو کچھ اور معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے اور جب تک ان قرآنی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے قرآن کا منشاء اور منطوق سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن فہمی کی راہ میں یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے سے وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو گئے جو آج ہمارے لئے اس درجہ وجہ پریشانی قلب و نظر بن رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے۔ یہی نہیں کہ ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے بلکہ بعض اوقات قرآنی مفہوم میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اور انسان، قرآنی آیات کو (معاذ اللہ) چیستاں سمجھنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کی ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس کے بعد ان اصطلاحی معنوں سے بات بالکل صاف ہو جائے گی۔ ان اصطلاحاتِ قرآنیہ میں "دنیا" اور "آخرت" کی اصطلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصطلاحات تک پہنچنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ حیات بعد الممات کا عقیدہ صحیح نہیں۔ حیات بعد الممات تو ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن میں جہاں آخرت سے مراد حیات بعد الممات ہے، وہاں اس سے فی الحقیقت حیات بعد الممات مراد ہے۔ ہم فقط اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف اسی مفہوم کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس وقت ہمارے سامنے انہی اصطلاحی معانی کی وضاحت ہے۔

"دنیا" کے لفظی معنی ہیں "قریبی" اور "آخرت" کے معنی ہیں "بعد میں آنے والا"۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں (انسان یا انسانوں کے گروہ، اقوام)۔ ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا افتادہ، قریبی مفاد (IMMEDIATE GAIN) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام تگ و تاز مفاد عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ بعد میں آنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فقط اپنے عیش و آرام کو سوچتے ہیں۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی۔ ان کی ساری جدوجہد "حال" کے لئے ہوتی ہے۔ "مستقبل" کی انہیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن ان پیش پا افتادہ، قریبی، مفادِ عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک "متاعِ دنیا" سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے۔ اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لئے تیار کرتا ہے (قرآن کی رو سے اس باب میں نسل سے مراد کسی انسان یا خاندان کی اپنی ذریت نہیں بلکہ آنے والی پوری انسانیت ہے)۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) مفاد عاجلہ (صرف اپنے حال کی خوشگواری) کے لئے کوشش کرتا ہے اس کا حال تو خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن اس کا مستقبل (آخرت) روشن نہیں ہوتا۔ لیکن انسانیت کی صحیح زندگی یہ ہے کہ انسانی کوششیں صرف حال کی خوشگواری میں ہی صرف نہ ہو جائیں بلکہ آنے والی انسانیت (یعنی مستقبل) کی خوشگواری کے لئے بھی جدوجہد کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پیش پا افتادہ مفاد (متاعِ دنیا) بڑی کشش و جاذبیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کی درخشندگی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے عیش و آرام کی زندگی ملتی ہے۔ اس میں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے اور اس کے نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس نظریہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے والی اقوام کی نسلوں کا مستقبل تیرہ و تاریک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس قوم کا "آخرت" میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ حال کے پیش پا افتادہ مفاد بالکل ابھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہٰذا مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے آن دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ اسے قرآن "ایمان بالغیب" کہتا ہے۔ یعنی "آن دیکھے نتائج پر ایمان"

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں۔ ان کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے۔ یہی ان کی متاع ہے۔ ان میں سے ایک جاتا ہے اور زمین میں ہل جوت کر اپنی اس متاعِ حیات کو "مٹی میں ملا آتا ہے"۔ دوسرا اس پر ہنستا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا کر گھر لے آتا ہے۔ اول الذکر کو مکئی اور باجرہ کی روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات فاقے بھی کاٹنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے کسان کے بچے مزے سے گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اس کسان کو "دنیا کی" (قریبی) خوش حالی نصیب ہو گئی۔ لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مستقبل اُس دوسرے کسان ہی کا روشن ہو گا جس کے گھر، ایک ایک دانہ، سات سات سو دانوں کے خوشے اور کھلیان بن کر آئے گا۔ بیج کو فصل بننے تک کا عرصہ تو اسے محنت اور مشقت سے گزارنا ہو گا، لیکن اس کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے گا کہ اس کا حال (دنیا) بھی خوشگوار ہو گا اور مستقبل (آخرت) بھی روشن۔ لیکن اس کے لئے شرطِ اولیں اس کسان کیلئے اس حقیقت پر ایمان ہے کہ میں نے جو دانہ مٹی میں ملا دیا ہے وہ ضائع نہیں جائے گا۔ کائنات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری ہے جو اس دانہ کو کونپل میں تبدیل کرے گا۔ کونپل ڈنٹھل بنے گی، ڈنٹھل میں خوشہ آئے گا اور خوشہ جھولیاں بھر بھر کر اناج دیدے گا۔ اسے اپنی محنت اور کائنات کے اس اٹل قانون کے نتائج پر یقین محکم ہونا چاہیئے۔ اگر اس پر یقین نہیں ہے تو یہ کبھی اپنے دانے مٹی میں نہیں ملائے گا۔ یہ بھی دوسرے کسان کی طرح انہیں پسوا کر گھر لے آئے گا۔ کائنات کا یہ قانون، جو دانہ کو خوشہ میں تبدیل کرتا ہے، سنۃ اللہ (قانونِ خداوندی) کہلاتا ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (لا تبدیل لسنۃ اللہ) اس کا اٹل اور غیر متبدل ہونا ہی اس پر ایمان کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ دانہ، خوشہ ضرور بن جائے گا۔ تو وہ اپنے دانوں کو مٹی میں ملانے کا خطرہ (RISK) بمشکل مول لیگا۔ اسے قرنہا قرن کے تجربے[1] نے بتا دیا ہے کہ فطرت کے اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ جب دانے کو ایک خاص قاعدے کے مطابق مٹی میں ملا دیا جائے تو وہ خوشہ میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اب یہ دوسری شرط سامنے آئے گی یعنی دانہ کو ایک خاص قاعدہ اور اصول کے مطابق مٹی میں ملایا جائے اور اس کے بعد وقت پہ اسے پانی پہنچایا جائے۔ اس پروگرام میں دیکھئے بیک وقت دو کوششیں مصروفِ عمل ہیں۔ ایک فطرت کا غیر متبدل قانون اور دوسرے کسان کی محنت۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی ہو گی تو خوشگوار نتیجہ برآمد ہو کر رہے گا (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں)۔ اگر کسان کی کوششیں قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی، تو اس کی محنت ضائع جائے گی (اولٰئک حبطت اعمالھم) قانونِ فطرت اور انسان کی کوششوں کی اس ہم آہنگی کو تقویٰ کہا جاتا ہے (وقی کے معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں۔)

تقویٰ کا مفہوم

کشمکشِ حق و باطل

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے کہ قانونِ فطرت، حق اور باطل کی کش مکش کا نام ہے۔ حق کہتے ہیں کسی اسکیم کے مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو جب وہ ٹھوس نتیجہ کی شکل میں سامنے آ جائے۔ اور باطل اس کے برعکس، اس کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہوتا ہے جو تخریب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شے کے تخریبی پہلو سے ایک تعمیری پہلو برآمد ہوتا ہے۔ دانے کا خاک میں مل کر پھٹ جانا[2]، اس اسکیم کا تخریبی پہلو ہے لیکن اس تخریب (DESTRUCTION) سے تعمیر (CONSTRUCTION) کونپل کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح

---

[1] انسانوں کا تجربہ جو نسلاً بعد نسل متوارث آگے چلا آتا ہے، تاریخ کہلاتا ہے۔ قرآن تاریخ کو اسی لئے بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ذکر کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ (تفصیل کسی دوسرے مقام پر ملے گی)

[2] فالق الحبّ والنوٰی (۹۵/۶) "دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا" اسی صفتِ خداوندی پر شاہد ہے۔

آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں یہ قانونِ کش مکشِ حق و باطل (تخریب و تعمیر[1]) سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کش مکش میں غلبہ ہمیشہ حق کا ہوتا ہے۔ یعنی آخر الامر تعمیری پہلو، تخریبی پہلو پر غالب آتا ہے اور اس طرح یہ کائنات اپنے تخلیقی مدارج طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ "تخلیقِ ارض و سما بالحق" سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی کائناتی قانون کا ماحصل تعمیر ہے، تخریب نہیں۔

کائنات میں یہ قانونِ خداوندی، اشیائے کائنات کے اختیار و ارادہ کے بغیر جاری و ساری ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ کل لہ قانتون۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان اپنی دنیا میں اس قانون کو اپنے اختیار و ارادہ سے نافذ کرے گا۔ یہاں کسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو بیج کے دانوں کو قانونِ قدرت کی ہم آہنگی میں سپردِ خاک کر دے۔ اور چاہے تو انھیں چکی میں پسوا کر روٹی پکا لے۔ اگر وہ اپنی محنت کو کائناتی قوانین کا ہم آہنگ بنا دے گا تو اس کی محنت اس طرح بار آور و ثمر بار ہو گی جس طرح آفاقی دنیا میں خدا کا قانون بار آور ہوتا ہے۔ وہاں بھی تعمیری پہلو (حق) کا تخریبی پہلو (باطل) پر غلبہ ہو گا اور یہاں بھی ایسا ہی ہو گا۔ لہٰذا جو چاہتا ہے کہ آخر الامر تعمیری پہلو غالب رہے اور اس طرح اس کا مستقبل روشن ہو جائے اسے چاہئے کہ وہ قانونِ خداوندی کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی کوششوں کو اس قانون سے ہم آہنگ[2] کر دے۔ ایسی قوم کا حال بھی درخشندہ ہو گا اور مستقبل بھی روشن۔

مقصودِ زندگی دنیا اور آخرت کے اس اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مقامات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال کے پیش پا افتادہ مفاد) کو خزف ریزے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاعِ حقیقی قرار دیا ہے، ساری بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر فرد یا ہر قوم صرف اپنی اپنی ذات کو سامنے نہ رکھے جس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان صرف اپنے ذاتی مفاد ہی کو مقصودِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ مقصودِ زندگی، نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ کیونکہ اس سے انسانیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود غرض انسانوں (یا اقوام) کو پیش پا افتادہ مفاد پر جھپٹ پڑنے والے قرار دیتا ہے اور ان مفاد کو متاعِ دنیوی (قریبی مفاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ انسان ہیں جو دنیا میں ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں پوری کی پوری انسانیت پروان چڑھے۔ اسے وہ مستقبل کی خوش حالی (آخرت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک محض قریبی مفاد (دنیا) کے حصول کی جد و جہد کبھی مستحسن قرار نہیں پا سکتی۔ اس کے نزدیک حقیقی سعی و طلب

---

[1] بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (۲۱/۱۸) ہم حق (کی تعمیری قوتوں) سے باطل (کی تخریبی قوتوں) پر نشانہ لگائے رہتے ہیں، تو حق کی تعمیری قوتیں، باطل کی تخریبی قوتوں کا سر کچل دیتی ہیں۔ اور اس کا مآل یہ ہوتا ہے کہ تخریبی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں (اور تعمیری قوتیں ٹھوس نتیجہ کی شکل میں باقی رہ جاتی ہیں)۔

[2] انسانی نظامِ تمدن و معاش میں، معاشی زندگی کے لئے قرآن نے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے، اور ان آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں، سماء کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن چاہتا یہ ہے کہ انسان کی معاشی زندگی، ان سماوی قوانین (مستقل اقدار) کے ساتھ ہم آہنگ رہے اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ اگر انسان کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس سے انسانی تمدن میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جنھیں وہ فساد فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر اس کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے ہم آہنگ ہو تو اس کا نتیجہ انسانی نظامِ اجتماعیہ میں ہمواری ہوتا ہے جسے وہ اصلاح کے نام سے پکارتا ہے۔ اعمالِ صالحہ ایسے کام ہیں جو انسانی نظامِ تمدن کی ناہمواریوں کو مٹا کر ان کی جگہ ہمواریاں پیدا کر دیں۔ سردست ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی معارف القرآن (جلد پنجم) میں ملے گی۔ انشاء اللہ۔

انسانیت کے مستقبل کی خوشگواری کے لئے ہونی چاہیئے۔ یعنی پوری کی پوری نوعِ انسانی کی خوش حالی، اپنی اور آنے والی نسلوں کی مرفہ الحالی۔ پوری کی پوری ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کی ترقی۔

قرآن ان دونوں گروہوں کی زندگی اور اس کے مآل کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ محض پیش پا افتادہ مفاد (حال کی بہبود) کی فکر کرتے ہیں، انھیں اپنی کوششوں کے نتائج فوراً مل جاتے ہیں لیکن ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

دو گروہ

فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا ومالہ فی الاخرۃ من خلاق (۲/۲۰۰)

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انھیں قریبی مفاد ہی مل جانے چاہئیں (انھیں وہ مفاد مل جاتے ہیں) لیکن ان کا مستقبل (کی خوشحالیوں) میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوں، انھیں اس کے مطابق حصے مل جاتے ہیں:

ومنھم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ اولئک لھم نصیب مما کسبوا۔ واللہ سریع الحساب (۲/۲۰۱)

اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشوونما دینے والا قانون ایسا کر دے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے اور مستقبل بھی، اور اس طرح وہ (بدحالیوں اور نامرادیوں کے) انسانیت سوز عذاب سے بچ جائیں، تو ان کی کوششوں کے نتائج انھیں اس طرح سے مل جائیں گے۔ اس لئے کہ اللہ (کا قانونِ مکافات) نتائج برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاتا (جس وقت وہ پختگی حاصل کر لیتے ہیں ٹھیک اسی وقت ان کا ظہور ہو جاتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم مستقبل کی خوش گواریوں اور مرفہ الحالیوں کے لئے جدوجہد کرے، اس کا حال تاریک ہو، اس لئے کہ مستقبل کی خوش حالی کے لئے ابتدائی جدوجہد کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں حال اور مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کسان والی مثال میں، جب وہ ابتدائی مشکلات پر قابو پا کر فصل تیار کر لیتا ہے تو فصل کے گھر آنے کے ساتھ ہی اس کا حال خوش گوار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اگلی فصل کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل پھر مستقبل کی مرفہ الحالیوں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ (۳۹/۱۰)

جو لوگ حسنِ عمل[1] کرتے ہیں، ان کی یہ دنیا (حال کی زندگی) حسین بن جاتی ہے۔

اور حال کے ساتھ، ان کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے۔

الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ لھم البشریٰ فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔ لا تبدیل لکلمٰت اللہ۔ ذالک ھو الفوز العظیم۔ (۱۰/۶۳)

---

[1] قرآن نے عمل صالحہ کو اعمال حسنہ کہہ کر پکارا ہے۔ حُسن کیا ہے؟ توازن وتناسب (PROPORTION) قائم رکھنے کا نام۔ اس سے الگ، حسن کی اور کوئی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جس طرح اعمال صالحہ کے معنی ایسے کام ہیں جو زندگی کی ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدل دیں۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کے معنی وہ اعمال ہیں جو انسان کی متضاد قوتوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن وتناسب قائم رکھ سکیں یہی کامیابیوں اور شادکامیوں کی اصل وبنیاد ہیں (تفصیل معارف القرآن میں ملے گی)۔

جو لوگ (زندگی کے اس صحیح نظریہ پر جو قرآن نے پیش کیا ہے) یقین رکھتے ہیں، اور پھر اپنی معاشی زندگی کو آسمانی قوانین سے ہم آہنگ کرتے ہیں (تقویٰ)۔ ان کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں۔ یہ خدا کا ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

یہاں تک ہم نے دو گروہ دیکھ لئے۔ ایک وہ جو صرف اپنے حال کو خوش گوار دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اول الذکر گروہ کا حال خوشگوار ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا، اور مؤخر الذکر کا حال اور مستقبل دونوں خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا۔ ومن یرد ثواب الآخرۃ نؤتہ منہا۔ (۳/۱۴۴)

جو صرف حال کی خوش گواریاں چاہتا ہے اسے یہ کچھ مل جاتا ہے۔ جو مستقبل کی تابناکی کیلئے خواہاں ہوتا ہے اسے وہ ملجاتا ہے۔

خدا کا قانون یہ نہیں کہ صرف حال کی خوشگواریاں چاہنے والوں کی کوششوں کو رائیگاں کر دے۔ وہ پیش پا افتادہ مفاد چلتے ہیں۔ انھیں یہ مفاد مل جاتے ہیں۔ اور جو مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں ان کی کوششیں اسی نہج سے بارآور ہوتی رہتی ہیں۔ دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کبریٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا:

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جہنم یصلہا مذموما مدحورا (۱۷/۱۸)

جو شخص (یا قوم) پیش پا افتادہ (فوری) فائدہ چاہتا ہے، تو ہم اپنے قانون کے مطابق، اسے مفادِ عاجلہ (فوری فائدہ) دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل میں اس کے لئے ایسی زندگی ہوگی جس میں ساری صلاحیتیں جھلس جائیں گی اور اس کا نشوونما رک جائے گا (جہنم کے یہی معنی ہیں) اور اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو بدحال اور ٹھکرایا ہوا پائے گا۔

یہ ایک گروہ ہوا۔ اور دوسرا گروہ۔

ومن اراد الآخرۃ وسعی لہا سعیہا۔ وہو مؤمن۔ فاولئک کان سعیہم مشکورا (۱۷/۱۹)

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو۔ اور اس کیلئے جیسی کوشش کرنی چاہئے ویسی کوشش کرے۔ اور وہ اپنی کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھے (کہ ایمان کے بغیر یہ کوشش ناممکن ہے) تو ان کی یہ کوششیں پورا پورا پھل لائیں گی۔

یہ فطرت کا قانون ہے، نہ اول الذکر گروہ کی کوششیں ضائع جاتی ہیں اور نہ ثانی الذکر کی۔

کلا نمد ہؤلاء وہؤلاء من عطاء ربک۔ وما کان عطاء ربک محظورا۔ (۱۷/۲۰)

ہماری نشوونما دینے والی سہولتیں (عطاء ربک[1]) دونوں گروہوں کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ تیرے رب (کے قانونِ نشوونما) کی بخشش عام کسی پر بند نہیں ہوتی)

ان کوششوں میں ہر قوم اپنی اپنی جدوجہد کے مطابق آگے بڑھتی جاتی ہے۔ انظر کیف فضلنا بعضہم علی بعض (۱۷/۲۱) "تاریخی نظائر پر غور کرو اور دیکھو کہ ہمارا یہ قانون معاشی کارگاہ میں کس طرح مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔" لیکن آخر الامر

---

[1] قرآن میں ربوبیت اس قانون کا نام ہے جو نشوونما دیتا ہے۔ عطاء ربانی وہ سہولتیں ہیں جو نشوونما کے لئے عام ملتی ہیں۔ ہوا، دھوپ، بارش، زمین، سب کے لئے بلا امتیاز و معاوضہ عام ہیں۔ یہ نہیں کہ حال کی خوش گواریاں چاہنے والوں پر یہ عمومی بخششیں بند ہو جائیں اور مستقبل چاہنے والوں پر اس کے دروازے کھل جائیں۔ خدا کا قانون مومن و کافر دونوں کے لئے یکساں ہے۔ دونوں کو اس قانون کے مطابق نتائج ملتے چلے جاتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ صرف حال کی خوش گواریاں چاہنے والے مٹ جاتے ہیں اور مستقبل کی مرفہ الحالیوں کے طالب بلند مدارج حاصل کر لیتے ہیں۔ وللاخرۃ اکبر درجٰت واکبر تفضیلا (۱۷/۲۱) "مستقبل کے درجات اور معاشی[۵۱] خوشحالیاں سب سے بڑھ کر ہیں"۔ اور مستقبل صرف اسی کے لئے ہوتا ہے جو معاشی زندگی کو ابدی قوانین (مستقل اقدار) کے تابع رکھے۔ اور اس طرح "ارض وسما"[۵۲] میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ لیکن جو قوم دنیا کی زندگی کے لئے کوئی الگ خدا تجویز کر لے (یعنی یہاں کی زندگی کے لئے اور قوانین وضع کر لے) اور آخرت کے لئے اور قوانین سامنے رکھے، تو یہ وہ شرک[۵۳] ہے جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لا تجعل مع اللہ الٰھا اٰخر فتقعد مذموما مخذولا (۱۷/۲۲)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔

لیجئے! یہ ایک تیسرا گروہ سامنے آ گیا۔

تیسرا گروہ گروہ اول ——— وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں۔ اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انھیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے۔ یعنی جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ ان کے سامنے اگر مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوعِ انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں۔ نیز وہ زندگی کو فقط طبیعی زندگی مانتے ہیں جس کا سلسلہ سانس بند ہو جانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

گروہ ثانی ——— وہ گروہ ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس ایک ضابطۂ حیات ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرتا۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہوتے ہیں۔ فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ۔ اس گروہ کو قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے۔ ان کے پیش نظر تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جو حال اور مستقبل کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ کوششیں ایسی ہیں جو صرف دنیا کی کامیابی عطا کرتی ہیں اور کچھ ایسی جو "عاقبت" سنوارتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس کی عاقبت سنور رہی ہو اس کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس کی دنیاوی زندگی نامراد و ناکام ہو اس کی آخرت کامیاب و کامران ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک آخرت سے مراد انسانیت کا مستقبل نہیں بلکہ مرنے کے بعد ہر فرد کی اپنی اپنی زندگی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہاں کی زندگی کو وہاں کی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ یعنی اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی خوش حالیوں اور ناداریوں کے لئے کوئی اور قانون کارفرما ہے اور اخروی کامیابیوں اور شادکامیوں کے لئے کوئی اور قانون۔ وہ ان دونوں کے لئے قانون کا سرچشمہ ایک نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دو دوائر میں الگ الگ "خداؤں" کا قانون رائج سمجھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کرنے والا ڈوب کر رہے گا۔

---

[۵۱] قرآن میں فضل کا لفظ معاشی خوشحالیوں کیلئے استعمال ہوا ہے۔

[۵۲] "ارض وسما" قرآن میں اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ارض، معاشی زندگی اور سماء آسمانی قوانین جن کے مطابق مستقل اقدار متعین ہوتی ہیں، اس کی تفصیل معارف القرآن میں ملے گی۔

[۵۳] شرک کے یہ معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے رکھے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور قانون۔

جو شخص درخت کی جڑ میں آگ جلاتا ہے اور پتوں پر پانی چھڑکتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ کسی انسان کے جسم کے ایک حصے کا خون صالح ہو سکتا ہے اور دوسرے حصے کا کثیف۔ اس کا ایمان ہے کہ پودے کی اولیں کونپل مرجھا کر خشک ہوتی ہے تو ہونے دیجئے۔ خوشے دانوں سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کونپل کے لئے الگ قانون ہے اور ڈنٹھل اور خوشوں کے لئے الگ قانون۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) حیاتِ کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت (Unity of Law) کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اسے کہہ دیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہوگا اور مستقبل بھی تاریک۔ غور کیجئے قرآن اس باب میں کس قدر ابھرے ہوئے الفاظ میں حقیقت کو واشگاف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے:

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ (۲/۸۵)

کیا تم قانونِ کائنات کے ایک حصے پر ایمان لائے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟

جو ایسا کرتا ہے،

فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزیٌ فی الحیات الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)

جو تم میں سے ایسا کرے (خواہ وہ اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے) اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ اس کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت[1] کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

قرآن، اس نہج زندگی کا نام "کفر بعد الاسلام" (۳/۹۰) قرار دیتا ہے اور اس گروہ کو وہ "منافقین" کی جماعت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے حال اور مستقبل دونوں کو تاریک بتاتا ہے (عذابا الیما فی الدنیا والاخرۃ ۹/۷۴) اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ معاشی زندگی میں ان کا کوئی پرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوتا (وما لہم فی الارض من ولی ولا نصیر ۹/۷۴)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے:

ایک گروہ وہ ہے جس کی حال کی زندگی، کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

ایک گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔

اس کے نزدیک ایسا گروہ کوئی نہیں ہو سکتا جس کا حال تو تاریک ہو لیکن مستقبل روشن۔ وہ کہتا ہے کہ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بہرحال تاریک ہوتا ہے۔ من کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری میں گزرے اور عاقبت سنور رہی ہو۔ جو ایسا کہتا ہے وہ حال اور مستقبل کی نشوونما کے لئے الگ الگ خداؤں کا قانون ماننا چاہتا ہے۔ یہ شرک ہے توحید نہیں۔ منافقت ہے، ایمان نہیں۔

زندگی کے ٹکڑے قرآن آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری دنیا نے، حیاتِ انسانی کو، طول اور عرض دونوں سمتوں میں بری طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ طول میں یوں کہ اس نے دنیا اور آخرت کو الگ الگ دنیائیں تصور کر رکھا ہے۔ دنیا ارباب حکومت کے سپرد ہے جو حال کو کامیاب بنانے کے مدعی ہیں۔ آخرت، ارباب مذہب کے قبضہ میں ہے جو لوگوں کی عاقبت

---

[1] قیامت کے قرآنی مفہوم کیلئے معارف القرآن کی آخری جلد تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔

سنوارنے کے دعویدار ہیں۔ عرض کی سمت دیکھا تو ہر فرد اپنے آپ کو الگ حیات کا پیکر سمجھتا ہے اور اگر زندگی کی بعض ضروریات کے تقاضے بعض انسانوں کو ایک جگہ جمع بھی کر دیتے ہیں (جنہیں شعوب و قبائل و اقوام کہا جاتا ہے) تو وہ گروہ صرف افراد کا مجموعہ بنتے ہیں وحدتِ حیات کے مظہر نہیں ہوتے۔ یہ تھی ساری آباد دنیا کی حالت نزولِ قرآن کے وقت۔ وہ حالت جس نے اسے "فساد فی البر والبحر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن نے کہا کہ حیات کی اس طرح تقسیم، نفسِ واقعہ (Facts) کے خلاف ہے۔ حیاتِ انسانی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے۔ وہ نہ طول کی طرف بٹ سکتی ہے نہ عرض کی سمت۔ طول کی سمت یہ ایک جوئے رواں ہے جس کا ہر قطرہ ندی کا لاینفک حصہ ہے اور یہ ندی ازاول تا آخر ایک ہی ندی ہے مسلسل و متواتر، غیر منقسم و غیر منقطع ازل سے ابد تک زمان (TIME) کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات، صرف گزرگاہوں کے نشانات ہیں۔ اور بس۔ اس لئے یہاں دنیا اور آخرت (حال اور مستقبل) کی تمیز نفسِ واقعہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب حقیقت حال یہ ہے تو یہ روش یکسر باطل ہے کہ حال کے متعلق ارباب حکومت کے قوانین عمل پیرا ہوں اور مستقبل کے متعلق، عمائد مذہب کے آئین و دساتیر۔ دوسری جانب عرض کی سمت آئیے تو مختلف افراد ایک نفسِ حیات کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح جیسے قمقمے، پنکھے، مشینیں، سب بجلی کی ایک لہر (ELECTRIC CURRENT) کے حرکیاتی مظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے افراد، شعوب، قبائل، اقوام کی تقسیم بھی غیر فطری ہے۔ تمام انسانیت ایک خاندان کے افراد، ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں جن کی اصل و بنیاد (BASE) ایک ہے۔

دین کیا ہے

یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اس نے صرف اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ انسانی نظامِ تمدن و معاشرت میں اس وحدتِ حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح سے ہوگا۔ یہ عملی طریق، جس سے یہ عظیم القدر حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے، دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا دین نام تھا اس طریق عمل کا جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے تھے، اور دوسری طرف تمام افرادِ نوعِ انسانی، ایک عالمگیر برادری کے ایسے اجزاء جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک، اس غیر مرئی حقیقت کو مشہود و محسوس شکل میں سامنے لانے کے ذرائع و اسباب تھے۔ یعنی یہ عوامل و عناصر تھے اس نظامِ زندگی کے جسے قرآن نے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ ان ذرائع و اسباب نے تھوڑے سے عرصہ میں الدین (نظامِ زندگی) کی حقیقتِ مجردہ کو لباسِ مجاز میں بایں نمط جلوہ طراز کر دکھایا کہ فرشتوں کی آنکھوں نے بداہتہً دیکھ لیا کہ "انی اعلم ما لا تعلمون" سے مفہوم کیا تھا! دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہیے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا) کہ تمام اقتدار انسانوں کے ہاتھ سے چھن کر اس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خود ساختہ نہ تھا بلکہ وہاں سے ملا تھا جو حیاتِ انسانی کا سرچشمہ ہے اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں اطاعت فقط قانون کی تھی۔ اور قانون کی اطاعت بھی غلام کی سی اطاعت نہیں بلکہ ایک اندرونی تقاضے کی تسکین۔ اس طرح جیسے پیاس بجھانے کے لئے پانی پینا اندرونی تقاضے کی تسکین ہوتا ہے، کسی کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس طرح دین کے نظام میں اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہا اور جب اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا تو زندگی کی ناہمواریاں بھی ناپید ہوگئیں۔ اس نظام کے حلقہ میں بسنے والی تمام جماعت کی زندگی کا نصب العین تھا انسانیت کے مستقبل کی درخشندگی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حال خود بخود روشن ہوگیا۔ اس لئے کہ، جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جس کا مستقبل روشن ہو اس کا حال ضرور تابناک ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن نے کیسی وضاحت سے اس قانون کو بیان کیا ہے

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشہاد (۴۰/۵۱)

ہم ان لوگوں کی کھیتیوں کو (جو مستقبل کی خوشحالی پر) ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے حال کی زندگی میں بھی سیراب[1] کرتے ہیں اور مستقبل میں بھی جب نتائج خود کھڑے ہو کر پکار اٹھیں گے۔

یہ نہیں کہ یہ نصرت یونہی اتفاقیہ عمل میں آجاتی ہے۔ بلکہ فرمایا کہ کان حقًا علینا نصر المؤمنین (۳۰/۴۸) "ہم پر مومنین کی نصرت فرض ہے"۔ غور کیجئے۔ قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری اور محکمیت کس قدر واضح انداز سے بیان کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اسی جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نحن اولیاءکم فی الحیاۃ الدنیا والاٰخرۃ۔ (۴۱/۳۱) "دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں ہم تمہارے پشت و پناہ ہیں"۔ قرآن نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ مستقبل کی خوش حالیوں کے ضامن نظام میں ابتداءً محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور نتائج نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، مفاد عاجلہ والے، تھوڑی سی کوشش سے محسوس نتائج سامنے لے آتے ہیں لیکن گھبراؤ نہیں، مفاد عاجلہ والے تم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا (۴/۱۴۱) ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا کا قانون مستقبل پر ایمان رکھنے والوں پر، کفار (صرف مفاد عاجلہ کو سامنے رکھنے والوں) کو غلبہ دیدے"۔ یہ لوگ اپنے سامنے مفاد عاجلہ کے ڈھیر دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں کہ زندگی کی دوڑ میں یہ آگے نکل گئے اور وہ پچھڑ گئے جنھوں نے مستقبل کو سامنے رکھا۔ ان کا یہ گمان غلط ہے۔ بیج بونے والا کسان کبھی اس کے مقابلہ میں ناکام نہیں رہ سکتا جس نے اپنے بیج کے دانوں کو پسوا کر روٹی پکالی۔ لایحسبن الذین کفروا سبقوا، انھم لا یعجزون (۲۹/۵۹) "مفاد عاجلہ والے یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ آگے نکل گئے۔ بالکل نہیں، یہ کبھی دوسرے گروہ پر بالادست نہیں ہو سکتے"۔ والعاقبۃ للمتقین۔ انجام کار غلبہ انھیں کا رہے گا جو حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ کفار (مفاد عاجلہ والوں) کا مومنین پر غلبہ پانا تو ایک طرف۔ یہ دونوں گروہ برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ افمن کان مؤمنا کمن کان فاسقا لا یستوون (۳۲/۱۸) "کیا مومن اور فاسق دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے"۔ پھر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ حال کی زندگی میں "کفار اور فاسقین" بڑھے ہوئے ہوں گے اور مومنین کا غلبہ صرف حیاتِ اخروی میں ہوگا۔ اُن کا حال درخشندہ ہوگا اور ان کا مستقبل۔ قرآن نے اسے بالکل واضح کر دیا کہ یہ غلبہ و تسلط اسی دنیا میں ہوگا۔ ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض۔ ام نجعل المتقین کالفجار (۳۸/۲۸) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں (فی الارض) [معاشی زندگی میں (فی الارض)] ان کو جو ایمان لائے اور انھوں نے زندگی میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے، ان کے برابر کر دیں گے جنھوں نے ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے؟ کیا ہم حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو ان کے برابر کر دیں گے جو ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں"[2] (فجار)۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بالآخرت کا فطری نتیجہ عاقبت بینی اور مآل اندیشی ہے۔ سو جو قوم عاقبت اندیش ہو اس کا مقابلہ وہ لوگ کس طرح کر سکتے ہیں جو دُور کی بات سوچ ہی نہ سکیں۔

---

[1] نصر کے معنی سیراب کرنا ہے۔ قرآن نے اعمال اور ان کے نتائج کے لئے عام طور پر کھیتی کی مثال دی ہے۔ ارض و سما کا باہمی امتزاج، یعنی بارش کے قطروں کا زمین کے ذرات سے ہم آغوش ہونا۔ زمین مردہ کی حیات بعد از موت، بیج کا پھوٹنا، کونپل کا ابھرنا، شاخ کا استوار ہونا، خوشے کا پکنا، پھلوں سے جھولیاں بھرنا وغیرہ سب "فلاح" (کھیتی) کی تعبیریں ہیں۔ اسی اعتبار سے اس نے نصرتِ خداوندی کو بھی سیرابی سے تعبیر کیا ہے۔

[2] فجر کے معنی ہیں پتھر کی چٹان کا پھٹ کر اس سے پانی بہہ نکلنا۔ فجار، دو پہاڑوں کے درمیانی راستے کو، اور انفجار پہاڑیوں کو بارود (DYNAMITE) سے اڑا دینے کو کہتے ہیں۔

جماعتِ مومنین

اور ان تمام دعاوی (یا قوانینِ فطرت) کی زندہ شہادت وہ نتائج تھے جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا اس جماعت سے بڑھ کر جسے قرآن نے مومنین کے خطاب سے پکارا ہے کسی اور جماعت کی آخرت بھی سنوری ہوئی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس جماعت سے بڑھ کر کسی اور جماعت کی دنیا بھی زیادہ کامیاب تھی؟ ان کی حکومت اسی زمین پر قائم ہو گئی تھی (لیستخلفنھم فی الارض)۔ ان کی جنت یہیں سے شروع ہو چکی تھی[1]۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو خدائی قانون سے ہم آہنگ کر لیا تھا (رضوا عنہ) اور خدائی قانون کی انقلاب آفریں قوتیں ان کی کوششوں سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ (رضی اللہ عنھم)۔ نتیجہ دنیا کے سامنے تھا۔

اسلام کی اس سب سے پہلی داعی جماعت نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ یونہی کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ قانونِ فطرت کا اٹل نتیجہ تھا جس طرح کسی معمل (LABORATORY) میں کیمیاوی تجزیہ اور امتزاج (CHEMICAL ANALYSIS AND SYNTHESIS) سے مخصوص نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ میں قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی و توافق سے بھی اٹل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انہی اٹل نتائج کا نام استخلاف فی الارض تھا جس میں انسانی زندگی کو کامل ہمواری اور توازن نصیب ہو گیا تھا۔ اور اس لئے اس میں حسن ہی حسن جگمگا رہا تھا۔ اس میں حیات، طول اور عرض دونوں میں اپنی وحدت قائم کئے ہوئے تھی۔ نہ آخرت دنیا سے الگ تھی اور نہ انسانیت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس جماعت نے تسخیرِ فطرت سے کائنات کی بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں اور ماحصلِ فطرت (متاعِ ارض) کو آسمانی قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا۔ یعنی متاعِ ارضی (دنیاوی اسبابِ زیست) کے حصول کے لئے ہر فرد کی اپنی اپنی بساط کے مطابق پوری جدوجہد اور کامل سعی و کاوش۔ اور اس مجموعی ماحصلِ متاعِ ارضی کی تقسیم اس انداز سے کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں (POTENTIALITIES) کے نشوونما پانے (FULLY DEVELOPED ہونے) کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔ اس کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت تھا۔

یہ تھا دین جس میں نہ ملوکیت کی سیادت تھی، نہ مذہبی پیشوائی کی قیادت۔ نہ طبقات کی تقسیم تھی، نہ بساطِ زندگی کی ناہمواریاں۔ نہ دنیا، آخرت سے الگ تھی، نہ حال مستقبل سے جدا۔

اس کے بعد؟

اب اس کے بعد تاریخ کا ایک ورق اور الٹئے اور ایک عجیب تماشہ دیکھئے۔ وہی قوم تھی اور ان کے ہاتھوں میں وہی قرآن۔ لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے پورے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلط تھی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت اپنے کامل تقدس اور طمطراق کے ساتھ مستولی۔ انسانیت طبقات میں بٹ چکی تھی اور زندگی کے قدم قدم پر ناہمواریاں درراہ تھیں۔

اس مقام پر فطرۃً یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر وہ نظامِ دین انسانی زندگی کی برومندی کا ضامن اور اس کی نشوونما کا کفیل تھا تو وہ مسلسل آگے کیوں نہ بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی جگہ پھر وہی غیر فطری نظامِ کہن کیوں مسلط ہو گیا؟

---

[1] قرآن کی رو سے جنت اور دوزخ کس طرح اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں اس کے لئے ضمنی طور پر میرے مضمون "نظریۂ ارتقاء" اور "نجات" ملاحظہ فرمائیے جو طلوع اسلام بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

میں اس سوال کا جواب متعدد بار دے چکا ہوں[1]، اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ دین کے جس نظام کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ نظام انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس نظام کی کفایت کو تسلیم کرتے ہیں تو سر دست اس بحث میں نہ جائیے کہ وہ مستقل طور پر قائم کیوں نہ رہا۔ دیکھئے صرف یہ کہ اگر اسی نظام کو پھر سے قائم کر لیا جائے تو انسانیت جگمگا اٹھے گی یا نہیں؟ یوں بھی اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں (یعنی مسلمان) جنہیں یہ تسلیم ہے کہ اس نظام میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام ناہمواریوں کو مٹا کر کاروانِ زندگی کو پھر سے متوازن و ہموار راہوں پر لے چلے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت اس بحث میں الجھنے کی بجائے (کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا) صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ (یعنی موجودہ مسلمان) جس ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس ذلت کے اسباب کیا ہیں اور اس کی اصلاح کی صورت کیا۔

بہر حال یہ آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے نظام میں بادشاہت (ملوکیت) کا کہیں نام تک نہ تھا اور مذہبی پیشوائیت کو کوئی جانتا نہ تھا۔ اب ہم تاریخ کے جس دور میں پہنچے ہیں وہاں ملوکیت بھی موجود تھی اور مذہبی پیشوائیت بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کی رو سے حیات کی وحدت غیر منقطع ہوتی ہے اس لئے اس میں حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ایک ہی قانون ہوتا ہے جو پوری کی پوری غیر منقسم حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ملوکیت[2] سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تصور کر لیا جائے۔ جب آپ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کا تصور تو رکھتے ہوں لیکن دنیاوی اصولوں کیلئے قانون کا سرچشمہ الگ تجویز کر لیں، تو لامحالہ آپ کو آخرت کیلئے بھی ایک جداگانہ ضابطہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ ضابطہ جو صرف آخرت سے متعلق ہو مذہب[3] کہلاتا ہے۔ لہٰذا ملوکیت اور مذہب، وحدتِ حیات کے ٹوٹنے کے بعد لازم و ملزوم طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جس طرح پانی کے ایک قطرہ کا تجزیہ کیا جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن جداگانہ اور متمیز تشخص کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔

مذہب اور ملوکیت

ملوکیت اگر مذہب کو اپنے اندر سمو لے تو دین وجود میں آجاتا ہے۔ اسی طرح اگر مذہب ملوکیت کو اپنے اندر مدغم کر لے تو دین متشکل ہو جاتا ہے۔ یعنی دین میں ملوکیت اور مذہب کا الگ الگ تشخص باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ملوکیت اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ مذہب اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اور مذہب اپنے قیام کے لئے ملوکیت کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح ان دونوں میں (بظاہر تضاد و تخاصم کے باوجود) باہمی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ کھشتری (حکومت کرنے والی قوم)

---

[1] معارف القرآن کے کئی ایک مقامات پر اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔ بایں ہمہ اگر سوال زیرِ نظر کے ضمن میں مزید توضیحات کی غرض سے اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی ضرورت پیش آئی تو میں اس کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا، اور یہ بھی کہ اس کے آگے نہ چلنے سے ان اصولوں پر کوئی حرف نہیں آتا جو مستقل اقدار کی حیثیت سے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔

[2] قرآن کی رو سے ملوکیت صرف یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کیلئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو۔ خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دین کے نظام میں وراثتِ اقتدار کا تصور یکسر باطل ہوتا ہے کیونکہ اس میں جب انفرادی اقتدار ہی نہیں ہو سکتا تو اقتدار کی وراثت کیسی؟

[3] آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں "مذہب" اور "دین" کے دو الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن، مذہب نہیں لایا تھا حتیٰ کہ "مذہب" کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب نظام دین مفقود ہو گیا۔ آج ہمارے پاس مذہب ہے، دین نہیں۔

براہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور براہمن، کھشتری کو اشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ محراب و منبر سے بادشاہ کو ظل اللہ قرار دیکر ایدہ اللہ بنصرہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تخت و تاج، مساجد و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف کرکے مذہبی سیادت کی حفاظت کرتا ہے۔ مذہب اس کے معاوضہ میں ملوکیت کے استحکام و بقا کے لئے لوگوں کے دل میں یہ فریب پختہ طور پر جاگزیں کرتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت چیز ہے۔ سیاست و حکومت کے دھندے "دنیا داروں" کے لئے ہیں۔ خدا کے نیک بندوں کو دنیاوی امور سے الگ رہنا چاہئے ان کا مقصود و منتہیٰ، آخرت کی نجات ہے۔ ان کا محبوب و مطلوب خدا کا دیدار ہے۔ جو جتنا اس دنیا میں ذلیل ہوگا، اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب و مقبول ہوگا۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس فسوں سازی سے، عوام کی توجہات آخرت پر مرتکز ہو جاتی ہیں اور ملوکیت اپنی ہوس رانیوں اور خون آشامیوں میں بے زمام ہو جاتی ہے۔ اب ملوکیت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی طرف سے لوگوں کو "صبر" (استبداد کے خلاف لب تک نہ ہلانے) کی ایسی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ہر جور و ستم کو خدا کی رحمت سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے مقربانِ بارگاہِ خداوندی کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ وہ مفلسی اور تباہ حالی کو "اللہ کے پیاروں" کی علامات قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ یوں مذہب کی فسوں کاریوں سے، ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ کے قدیم ایام میں، مذہب کو اپنی دسیسہ کاریوں اور ابلہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی دین کے ضوابط (جو حضرات انبیاء کرام کے وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے۔ اس لئے اربابِ مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ بھی میں آیا اُسے "کتاب اللہ" کہہ کر پیش کر دیں۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔ لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں دین کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصل شکل میں موجود تھا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا۔ اس لئے اب مذہب کو اپنی فسوں کاریوں کے لئے کاوش کرنی پڑی ان حالات میں کامیابی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ دین کے ضابطہ قرآن کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیا جائے لیکن ان کے مقصود و مفہوم کو یکسر بدل دیا جائے۔ چنانچہ

مذہب کے حربے اس کے لئے مذہب نے یہ عقیدہ عام کیا کہ کلامِ الٰہی (ضابطۂ دین۔ قرآن کریم) کے الفاظ میں برکت ہے (معنوں میں نہیں۔ الفاظ میں) انھیں صرف دہراتے رہنا چاہئے[1] (جس طرح ہندو مذہب میں منتروں کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں) اسے تلاوتِ قرآن کہتے ہیں یعنی بغیر سمجھے الفاظ کو دہراتے رہنا۔ (حالانکہ تلاوت کے معنی ہی کسی کے پیچھے چلنا یعنی پیروی کرنا ہے) دیکھئے۔ اس ایک حیلے سے مذہب اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہو گیا۔ دین کا ضابطہ (قرآن) بھی مسلمانوں کے سامنے رہا۔ اور انھیں قرآن سے یکسر الگ بھی کر دیا۔ مذہب نے تلاوتِ قرآن (یعنی بے سمجھے اس کے الفاظ کو دہراتے رہنے) کے ثواب میں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ساری قوم اس میں الجھ کر رہ گئی۔ حالانکہ اسی قرآن میں منافقوں کے متعلق یہ مذکور ہے کہ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم (۳/۱۶۷) "وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا"۔ بلا سمجھے الفاظ کے دہراتے رہنے سے بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا رہتا ہے جن کا کوئی مفہوم اس کے دل میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح قرآن میں ہے کہ حالتِ سُکر (نشہ) میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ کیونکہ تم اس وقت جو کچھ زبان سے کہتے ہو اسے سمجھتے نہیں اس سے ظاہر ہے کہ صرف الفاظ دہراتے رہنا یکسر بے سود ہے۔

ذرا آگے بڑھئے تو پھر تفاسیر کے ذریعے ان تمام قرآنی اصطلاحات کو جنھیں دین نے اپنے نظام کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا تھا

---

[1] الفاظ میں تاثیر کا تصور انسانی تاریخ کے عصرِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ منتر، تعویذ، گنڈے ورد، وظیفے۔ قرآنی آیات کے "اعمال" سب اسی اصل کی شاخیں ہیں۔

نئے معنی پہنانے شروع کر دیئے جس سے ہر بات "آخرت" سے متعلق ہو جائے اور لوگوں کی نگاہوں میں "دنیا" ذلیل و قابلِ نفرت شے بن جائے۔ اعمال، جزا، سزا، حسنات، سیات، فلاح، خسران، عزت، ذلت، سرخروئی، روسیاہی، سب کے سب "آخرت" پر اٹھا کر رکھ دیئے گئے۔

اب آئیے "دین" کے اُن ارکان کی باری، جو اس نے اپنے نظام کے قیام کے لئے تجویز کئے تھے۔ کلمہ، صلوٰۃ، قیام، زکوٰۃ، حج، یہ سب ذرائع تھے نظامِ دین کے قیام و استحکام کے۔ مذہب نے انھیں رسوم بنا کر مقصود بالذات قرار دیدیا۔ یعنی یہ اعمال کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی ادائیگی ہی مقصود ہے۔ اور بس۔

جن طبائع میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن کے الفاظ دہرانے یا ارکانِ اسلام ادا کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ تو ان کی تسکین کے لئے کہہ دیا کہ ان سے ثواب[1] حاصل ہوتا ہے اور یہ ملے گا آخرت میں جا کر۔ ثواب کا لفظ ایسا مبہم ہے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات نہ بنے وہاں کہہ دیجئے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ آپ کہنے والے سے کہئے کہ صاحب! ثواب عربی کا لفظ ہے اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ ارشاد فرما دیجئے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ آگے چل ہی نہیں سکے گا۔ المیہ یہ کہ مذہب کا سارا کھٹراگ ہی مبہمات پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں ثواب کا تصور بھی مبہم ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس حقیقت یا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔

اب آیا خدا۔ سو اس کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آسمانوں میں بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی پرستش کرتے رہیں۔ پرستش، ترجمہ ہو گیا عبادت کا۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ قوانینِ الٰہیہ کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کرو اور اپنی زندگی اس نظام کے تابع بسر کرو، اس کا نام تھا عبادت۔ مذہب نے اسے پرستش سے بدل دیا یعنی ایک خاص وقت پر، خاص انداز میں، خاص قسم کی حرکات و سکنات۔ اور ان کے متعلق کہہ دیا کہ ان سے اللہ خوش ہو جاتا ہے اور اگر ایسا کچھ نہ کیا جائے تو وہ ناراض ہو کر جہنم کی آگ میں جھونک دیتا ہے۔

عوام، ملوکیت کا استبداد اپنے سامنے دیکھتے تھے۔ مذہب کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس سے ان میں ملوکیت کی مخالفت کا احساس نہ ابھر آئے۔ اس کی پیش بندی کے لئے اس نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتا۔ ان بادشاہوں کی کیا مجال ہے کہ یہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں۔ یہ ہمارے سامنے یونہی اکڑتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ان کی کیا حیثیت ہے۔ اس لئے ان کا کیا مقدور ہے کہ یہ اُس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکیں۔ لہٰذا جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا ہے سب مشیت ایزدی سے ہوتا ہے۔ "خدا شناس" کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تیر کو دیکھے، اُسے ہر وقت نگاہ تیر انداز پر رکھنی چاہئے۔ اس عقیدۂ تقدیر نے ملوکیت کی گرفت کو فولادی بنا دیا۔ اب ان کی ہر شیطنت، خدا کی مشیت کا مظہر قرار پا گئی، جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

روایات سازی مذہب نے اپنا جال بچھانے کے لئے یہ تمام حربے استعمال کئے لیکن اس کے باوجود اسے اپنی کامیابی کا کلی اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے کہ لوگ مذہب سے ان تمام باتوں کی سند مانگتے تھے اور قرآن سے ان کی سند ملتی نہیں تھی۔ اس کے لئے مذہب کو ایک بڑی مقدس پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ اور یہ تھی روایات پرستی کی پناہ۔ روایات سازی ویسی ہی

---

[1] "ثواب" کے قرآنی مفہوم کے لئے دیکھئے میرا مضمون "نجات" جو طلوعِ اسلام کی اکتوبر ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے فرمایا ہے کہ فَاٰتٰھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا (۳/۱۴۸) یعنی انھیں اللہ دنیا میں "ثواب" (یا دنیا کا ثواب حصہ) بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ثواب کوئی ایسی شے نہیں جس کا تعلق اس دنیا سے نہ ہو۔ یا وہ ایسی غیر محسوس شے ہو کہ انسان کو پتہ ہی نہ چلے کہ اسے ثواب ملا ہے یا نہیں۔

آسان تھی جیسی پہلے مذاہب میں کتاب اللہ کی تحریف۔ بلکہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا اس سے بھی زیادہ آسان۔ جس کسی کے جی میں آیا ایک عربی کا فقرہ گھڑا۔ اس سے پہلے "حدثنا زید عن عمر عن بکر۔ قال قال رسول اللہؐ" کے الفاظ بڑھائے۔ لیجئے! یہ عربی کا فقرہ مذہب کی سند (یعنی حدیث رسول اللہؐ) بن گیا۔ رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے جس قدر عقیدت مسلمان کو ہو سکتی ہے وہ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اس لئے جو قول یا عمل رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا جاتا، وہ از خود مقدس اور واجب الاحترام ہو جاتا۔

دین میں تحریف و الحاق کا یہ طریقہ سابقہ مذاہب کی تحریف و الحاق سے بھی زیادہ آسان اور دور رس تھا۔ اُن مذاہب میں تحریف و الحاق کسی نہ کسی کتاب کے گوشوں کے اندر کرنی ہوتی تھی۔ یہاں کتابِ الٰہی کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اور "دین سازی" کے لئے کھلا میدان ہاتھ آگیا۔ اب ان تمام اباطیل و خرافات کے لئے جن سے ملوکیت اور مذہب کو تقویت ملتی تھی، مقدس اسناد موجود تھیں۔ جو بات منوانی چاہی اس کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کر دی۔ اب کس کی ہمت تھی جو یہ کہہ دیتا کہ میں رسول اللہؐ کا فرمان نہیں مانتا۔ اگر کسی نے کسی معاملہ میں اتنا کہہ دیا کہ یہ بات تو قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس کا نہایت آسان جواب موجود تھا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ زیادہ سمجھتے تھے۔ کہئے! اس کا کیا جواب تھا؟ اس سے اور آگے بڑھے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث، قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اسلئے اصل دین حدیث قرار پا گئی اور قرآن اس کے تابع چلا گیا۔ یعنی قرآن ان لوگوں کی خود ساختہ مفروضات کے تابع ہو گیا۔

جب تک روایات سازی کا یہ سلسلہ زبانوں تک محدود رہا ان میں ہر آن اضافے ہوتے رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انھیں کتابوں میں درج کر دیا گیا جس سے مزید روایات سازی کا سلسلہ رک گیا۔ لیکن مذہب کو ابھی مزید اسناد کی ضرورت رہتی تھی۔ ملوکیت کے نت نئے تقاضے اس کے مقتضی تھے کہ اس کی تقویت کے لئے تازہ ترین اسباب مہیا کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔

ائمہ پرستی دین کا نظام یہ تھا کہ قرآن میں اصولی قوانین دیدیئے گئے تھے جن کی روشنی میں جزئی احکام اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق، ملت نے خود مرتب کرنے تھے[1]۔ یہ تدوین جزئیات "تفقہ فی الدین" (دین کے اصولی قوانین پر غور و فکر کرنے) سے ہوتی تھی۔ یہ جزئیات مرکزِ نظامِ ملت کی طرف سے مرتب اور قانون کی شکل میں نافذ ہوتیں۔ اسی کو اسلامی شریعت کہتے ہیں۔ دین کا نظام ختم ہوا تو مذہب نے اپنی تقویت کے لئے، روایات کے بعد اس "تفقہ" (فقہ) سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان فقہی احکام کی سند کے لئے رسول اللہؐ تک بھی نہیں پہنچنا پڑتا تھا۔ ان کی نسبت "ائمہ فقہ" میں سے کسی کی طرف کرنی ہوتی تھی اور ائمہ فقہ میں جسے جی چاہے شامل کر لیا جا سکتا تھا۔ اب رسول پرستی سے آگے بڑھے تو ائمہ پرستی شروع ہو گئی۔ اس میں ملوکیت اور مذہبیت کو اپنی تقویت کے لئے اور بھی زیادہ سامان مل گیا۔

تصوف روایات اور فقہ میں کسی حکم کی سند کو رسول اللہؐ یا کسی امامِ فقہ تک بہر حال پہنچانا پڑتا تھا۔ اس میں بعض اوقات دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ روایات کتابوں میں مدون ہو چکی تھیں۔ فقہی مسائل بھی رفتہ رفتہ کتابوں میں جمع ہو گئے اور ائمہ کی فہرست بھی محدود ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع ہو گیا کہ اب کسی اور کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ یہ راستہ بند ہوا تو ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں کسی حکم کے لئے کسی سند کی ضرورت ہی نہ تھی، یہ تھا سلسلۂ کشف و الہام۔ ایک بزرگ کہہ دیتا تھا کہ مجھے یہ بات کشف سے معلوم ہو گئی ہے۔ اور کشف سے مراد تھی براہِ راست خدا سے ہم کلامی۔ یا وہ "علم لدنی" جو بغیر ظاہری اسناد کے رسول اللہؐ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یعنی ختمِ نبوت کا عقیدہ بھی اور خدا سے ہم کلامی کا دعویٰ بھی۔ رسول اللہؐ کے متعلق خدا کے اس حکم پر بھی ایمان ہو کہ

---

[1] تفصیل اس اجمال کی میرے مضمون "اسلامی نظام" اور اس کے تضمنات میں ملے گی جو طلوعِ اسلام میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

بلغ ما انزل علیك (جو آپ پر وحی کیا جاتا ہے اسے سب تک پہنچا دو) اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی کہ رسول اللہؐ نے "دین کا مغز" کھلے بندوں دنیا تک نہیں پہنچایا تھا۔ اسے سربستہ راز کے طور پر اس طرح سینہ بہ سینہ آگے منتقل کیا تھا کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ یہ تھا تصوف۔ اس میں "مذہب" اپنے مقصد میں اور بھی کامیاب ہو گیا۔ یعنی مذہب کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے کہ دنیاوی امور، دنیا داروں کے لئے ہیں اور مذہب کا کام انسان کی عاقبت سنوارنا ہے۔ تصوف میں یہ عقیدہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کشف و کرامات یہ خدا سے ہم کلامی اور رسول کے علم لدنی کی وراثت صرف اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو دنیا کو یکسر ترک کر دے۔ جس کے دل میں دنیا کا ذرہ بھر بھی خیال باقی رہا وہ اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس مسلک نے ملوکیت کو یکسر بے لگام کر دیا۔ اسی جہت سے ہم نے تصوف کو مذہب کی انتہائی شکل قرار دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر دین کا تصور کسی دھندلی سی شکل میں بھی باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی رو سے مقصد زندگی قرار پاتا ہے انفرادی نجات۔ اور تصوف کی رو سے انفرادی نجات (تزکیہ نفس) کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے ترک دنیا۔ ترک لذات!

اختلافات

جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں، اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا میں بیس مختلف مقامات پر سائنسداں، اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں، پانی کا تجزیہ کر رہے ہوں۔ ان سب کا نتیجۂ عمل ایک ہوگا اس لئے اس باب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا (MATTER OF FACT WORLD) سے الگ ہو کر محض نظری اور مجرد (ABSTRACT) مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کیلئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہٰذا دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک قانون۔ ایک نظام۔ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک جماعت، ایک نہج فکر، ایک طریق کار۔ لہٰذا ایک ہی نتیجہ، پھر تشتت و انتشار اور تباین و افتراق کہاں سے آسکتا تھا؟ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مذہب کی ساری گفتگو "آخرت" سے متعلق تھی۔ اور آخرت کسی کی آنکھوں کے سامنے تھی نہیں جو یہ معلوم ہو جاتا کہ مذہب کے دعاوی صحیح ہیں یا غلط۔ مثلاً ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے اس سے آپ کی نجات ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ نہیں یوں نہیں، یوں پڑھئے، تب آپ کی نجات ہوگی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات ہوگی۔ لہٰذا نظری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج اگلی دنیا پر اٹھا رکھے جائیں اختلاف لازمی ہے۔ اسلئے اگر دین کی امت واحدہ، مذہب میں پہنچ کر بہتر فرقوں میں بٹ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ یہ تفریق و تقسیم یہ تحزب و تشیع ایسی چیز تھی جس سے مذہب کو اپنی گرفت کی ڈھیلی میں کچھ خطرہ ہو سکتا تھا لیکن اس کے پاس ان خطروں کی روک تھام کے لئے بڑے بڑے مقدس حربے موجود تھے۔ اس نے حجت سے عربی کا ایک فقرہ (اختلاف امتی رحمۃ۔ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔) تراشا اور اسے منسوب کر دیا اس ذات گرامی کی طرف جس کی بعثت کا مقصود تمام نوع انسانی کی وحدت تھی۔ جب یہ فقرہ حدیث بن گیا تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا؟ قرآن اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا۔ لیکن اس حدیث نے اسی شرک کو عین رحمت بنا کر دکھا دیا۔

یہ کچھ مذہب کی طرف ہو رہا تھا۔ دوسری طرف دنیا والے (ارباب ملوکیت) باہم خانہ جنگیوں میں مصروف پیکار تھے۔ دین میں اقتدار اشخاص کے ہاتھوں میں نہیں رہتا لیکن ملوکیت میں تمام کا تمام اقتدار و اختیار انسانوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ جب قوت کسی ایک انسان کے ہاتھ میں آجائے تو ہر شخص یہی چاہے گا کہ وہ قوت اس کے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذا ملوکیت کے نظام میں حکومت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب نے حالت یہ پیدا کردی کہ ملت کی عظیم اکثریت کو امورِ دنیا سے نفرت دلا کر "عاقبت سنوارنے" کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ اور نظری مباحث سے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرکے انھیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ دوسری طرف دنیا سمٹ کر چند افراد یا چند خاندانوں کے قبضہ میں آگئی اور ان میں اس کی تقسیم پر باہمی کشت وخون شروع ہوگیا۔

لہٰذا جب امن ہوتا تھا تو ملت، مذہبی مباحثات ومناقشات میں الجھی رہتی تھی اور جب ارباب اقتدار میں باہمی جنگ ہوتی تھی تو مذہب اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر ملت کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا۔ جہاں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی اور اس طرح ان میں سے قتل کرنے والا غازی اور قتل ہونے والا شہید قرار دیدیا جاتا تھا۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ من یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما (۹۳/۴) جو ارادۃً کسی مومن کو قتل کردے تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار رہے گا۔ یہ خدا کا فرمان تھا۔ لیکن ارباب مذہب ان قاتلوں کو جنت کے پروانے تقسیم کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہی ملوکیت کا تقاضا تھا۔ مذہب کا منصب، ملوکیت کا استحکام (اور اس طرح اپنی بقا) تھا۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اگر کوئی شخص اس پر تھوڑے سے وقت کیلئے بھی خالی الذہن ہوکر غور کرے گا تو وہ بلا تامل اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ سب باتیں خلافِ عقل وبصیرت تھیں۔ اس لئے اس کے دل میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہب نے اس قسم کی باتوں کو منوا کیسے لیا۔ اسلام نہ سہی، وہ لوگ بالآخر انسان تو تھے۔ اگر وہ قرآنی بصیرت سے نہیں، محض انسانی دانش ہی سے کام لیتے تو مذہب کے ایسے کھلے ہوئے، کمزور، حربوں کا کبھی شکار نہ ہوتے!

مذہب بھی اس خطرہ کو محسوس کرتا تھا اس لئے اس نے اس کی روک تھام کی بھی فکر کرلی تھی۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں

دین، اپنی دعوت کی شہادت کے لئے اپنے ٹھوس، تعمیری نتائج پیش کرتا تھا۔ اس لئے اس کی دعوت یکسر علی وجہ وبصیرت تھی (ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی) لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی۔ اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مذہب کی دنیا، شعور وادراک کی حدوں سے ماورا ہے۔ اس لئے ان معاملات میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ جو عقلی توجیہات طلب کرے گا وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہوگا۔ اسلئے کہ "اول من قاس ابلیس" جس نے سب سے پہلے عقلی قیاس سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا۔ اس کے برعکس جنت بیوقوفوں کے لئے ہے (اھل الجنت بلہ)۔ لہٰذا، جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے، سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کئے جاؤ۔ مذہب نے اپنے اولین مخاطب سے تو یہ کہا۔ اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کرکے ان کی تقلید کئے جاؤ۔ یہی راہ صواب ہے۔ یہی جنت کا سیدھا راستہ ہے۔

تقلید

یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصور، تباہی اور بربادی کا پیغام بر ہوتا ہے لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ غور کیجئے۔ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز شے کون سی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے۔ اب جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کردیا جائے اس کی رو سے انسان، حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل ودانش سے کام نہ لینے والوں کو شر الدواب (بدترین خلائق) اور حیوانات سے بھی گئے گزرے ہوئے قرار دیا ہے (اولئک کالانعام بل ھم اضل) تقلید سے انسان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔

دل تو ہوتا ہے لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا۔ آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ ولھم اذان لا یسمعون بھا۔ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے کبھی سنتے نہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ یہ سیدھے جہنم میں جاتے ہیں (۷/۱۷۹) ان کا مسلکِ زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس روش پر اپنے اسلاف کو دیکھا، گوش بند و چشم بند و لب بند اس روش پر اندھا دھند چلے جاتے ہیں۔ انھم الفوا اباءھم ضالین۔ فھم علی اثارھم یھرعون (۳۷/۶۹-۷۰)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے۔ ثم ان مرجعھم لالی الجحیم (۳۷/۶۹) ذرا اس حقیقتِ کبریٰ پر غور کیجئے کہ قرآن نے اسلاف کی کورانہ تقلید کرنے اور اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کی تبیین کا یہ مقام نہیں۔ اس کے متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کی جا سکے گی[51]۔ اس وقت صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ کائنات میں ہر شے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے، کسی حادثے سے آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح، انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقا جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقا علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنھیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ قابلِ نمو ذی حیات کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن، ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اور کسی ایک مقام پر رُک جانے کا نام جہنم رکھتا ہے[52]۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اس نے جہنم کے ایندھن کے لئے الناس (انسان) اور حجارۃ (پتھروں) کو ایک ہی شق میں شمار کیا ہے (وقودھا الناس والحجارۃ)۔ قانونِ ارتقا کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ جس عضو سے کوئی ذی حیات کام لینا چھوڑ دے، رفتہ رفتہ فطرت اس عضو کو بیکار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے۔ اس طرح جب کوئی قوم سوچ سے کام لینا ترک کر دے تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے تقلید کا وہ تباہ کن اور دُور رس اثر جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس سے صرف موجودہ نسل ہی تباہ نہیں ہوتی اُس قوم کی آنے والی نسلیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں انسان پیدا ہی نہیں ہوتے حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مرجاتے ہیں۔ تقلید کی انہی ہلاکت آفرینیوں اور تباہ کاریوں کے پیشِ نظر قرآن نے اس شد و مد سے اس کی مخالفت کی ہے کہ باید و شاید۔ اس نے بتایا ہے کہ ہر رسول کا پیغام تقلید کی مخالفت کرتا تھا اور اسی بنا پر ان کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ وہ مقلدین کو علم و دانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے اور یہ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتے تھے۔ خدا کے رسول اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجھوڑتے تھے اور قوم اتنی ہی سختی سے اس کی مخالفت کرتی تھی۔ ان کی مخالفت بھی بجا تھی۔ علم الحیوانات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ (خفاش) کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ چمگادڑوں نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا تو اب ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہو گئی ہے کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب ہی نہیں لا سکتے۔ اس لئے ان کا

---

[51] دیکھئے میرے مقالات "نجات" اور "ارتقا"۔ مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۵۱ء

[52] جہنم کے مرادف عربی لفظ جحیم ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں۔

سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے۔ وہ تو یوں کہئے کہ ان کا بس نہیں چلتا، ورنہ وہ کبھی سورج کو افق سے ابھرنے نہ دیں۔ رسول دین کی روشنی عطا کرتے تھے اور ان لوگوں کی حالت چمگادڑوں کی طرح ایسی ہو چکی تھی کہ انھیں اس روشنی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اس لئے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کا یہی پیغام تھا اور ہر رسول کی اسی طرح مخالفت ہوتی رہی۔ وہ حضرت نوحؑ کے متعلق کہتا ہے کہ جب انھوں نے دین کی روشنی کی طرف دعوت دی تو آپ کی قوم نے اس دعوت کا یہی جواب دیا کہ ما سمعنا بھذا فی اٰبائنا الاولین (۲۳/۲۴) "ہم نے یہ بات اپنے اسلاف کے ہاں نہیں سنی" اس لئے ہم اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا جب آپ کی قوم نے کہا کہ اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا (۱۱/۶۲) کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں؟" یہی کچھ قوم شعیبؑ نے کہا (۱۱/۸۷) یہی جواب حضرت موسیٰؑ کو ملا۔ قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ اٰباءنا (۱۰/۷۸) "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو دیکھا ہے؟" یہی قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قالوا وجدنا اٰباءنا کذٰلک یفعلون (۲۶/۷۴) "انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔" یہی جواب حضور نبی اکرمؐ کو ملا۔ سورۂ لقمان میں ہے:-

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اٰباءنا (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی کی اتباع کریں گے جس کی اتباع ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔

غور کیجئے۔ قرآن نے دین اور مذہب کا فرق کتنی وضاحت سے بتایا ہے۔ مذہب، اسلاف پرستی (تقلید) سکھاتا ہے۔ دین اس تقلید سے روکنے کے لئے آتا ہے تاکہ انسان، وحی کی اصولی روشنی میں، اپنی عقل و خرد سے کام لے کہ یہی شرف انسانیت اور احترام آدمیت ہے۔ لیکن قرنہا قرن کی تقلید نے ان کی آنکھوں کو چمگادڑ کی آنکھیں بنا دیا ہوتا ہے، اس لئے انھیں روشنی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ اس کی مخالفت میں چلا اٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کے ساتھ یہی ہوتا رہا (۳۶/۳۰) وہ تاریخی نظائر و شواہد سے بتانا یہ چاہتا ہے کہ تقلید سے انسان کی نگاہ ایسی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، اسے ماریسیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔ تقلید میں چونکہ مستقبل تاریک اور ماضی درخشندہ نظر آتا ہے۔ اس لئے انسان کی نگاہیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہیں۔ اس کا منہ الٹا ہوتا ہے (یعنی آنکھیں گدی کی طرف ہوتی ہیں) یہی جہنم کی زندگی ہے۔ یوم تقلب وجوھھم فی النار (۳۳/۶۶) "جس دن ان کے چہرے جہنم میں اُلٹے کر دیئے جائیں گے۔" یہی وہ اوندھے منہ چلنے والے ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے کہ افمن یمشی مکبًا علی وجھہ اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم (۶۷/۲۲) "کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلا جا رہا ہو سیدھے راستہ پر ہے یا وہ جو ہموار و متوازن راہ پر سیدھا چلا جا رہا ہو" سورۂ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسوم کہنہ کے طوق و اغلال اس بری طرح سے گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اوپر کی اوپر اٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ انا جعلنا فی اعناقھم اغلٰلا فھی الی الاذقان فھم مقمحون (۳۶/۸)۔ "ہمارے قانون نے ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک چڑھ گئے ہیں جس سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان کے سر اوپر کے اوپر کو اٹھے رہتے ہیں"۔ اور یہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وہ اطواق و اغلال تھے جنھیں اتارنے کے لئے رسول اکرمؐ تشریف لائے تھے۔ (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم ۷/۱۵۷)۔ جب ایک عرصہ کی تقلید سے قوم کے توائے فکر یہ اس طرح مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ تو قرآن کے الفاظ میں اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وجعلنا من بین ایدیھم سدًا ومن خلفھم سدًا فاغشینٰھم

فہم لا یبصرون (۷:۱۷۹)۔ ہمارا قانونِ فطرت ان کے سامنے بھی دیواریں کھینچ دیتا ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور (ان کی عقل وخرد پر) پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور ان کی بصارت سلب کر لی جاتی ہے۔

اسی حقیقت پر باندازِ دگر غور کیجئے۔ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ہر نسل اپنے لئے آپ راہیں تراشے۔ عام راستوں سے ہٹ کر سوچنے والے انسان (یعنی مقاصد کی تخلیق کرنے کے اہل دماغ) بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اسی لئے ہر آنے والی نسل کے لئے یہی راہ آسانی اور احتیاط کی تھی کہ وہ اپنے اسلاف کی باتوں کو جمع کرکے ان پر عمل پیرا ہوتی رہے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ یوں بھی اس زمانے میں زندگی کی رفتار ایسی سست تھی کہ نئے تقاضے جلدی جلدی سامنے نہیں آیا کرتے تھے۔ قرآن نے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اب عقل وعلم کے خزانے عام کردیئے گئے ہیں۔ اب ذہنِ انسانی سنِ رشد وبلوغت کو پہنچ چکا ہے اسلئے اب انسانوں کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ استقرائی علم سے اپنی راہیں آپ تراشے۔ اس نے انسانی سعی وکاوش کو ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچانے کے لئے وہ مستقل اصول دیدیئے جو مرورِ زمانہ سے تغیر پذیر نہ ہوں، اور کہہ دیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر نسل اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل آپ تلاش کرے۔ گزشتہ نسلوں کا تجربہ (جسے تاریخ کی یادداشتیں کہتے ہیں) بھی کارآمد شے ہے اس لئے قرآن نے اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ لیکن اس تجربے سے مستفید ہونے اور آنکھیں بند کرکے پرانی ڈگروں پر چلے جانے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ دین کا نظام تھا لیکن مذہب نے آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر بڑھنے والی انسانیت کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں وہ انسان کے عہدِ طفولیت میں تھی اور اس طرح وہ انسان کی تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے گیا۔

مذہب تقلید کے عقیدہ سے انسانوں کو اس مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ ایسی قوم میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی کیسے رہ سکتی ہے؟

جذباتِ نفرت

اب آگے بڑھیئے۔ دنیا سے تنفر اور علم وعقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قابلِ نفرت بن جاتی ہے۔ چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہ میں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ انہیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی انہیں جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے۔ جب بہار خوشی کے جھولے جھولتی ہے تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ جب چاندنی مسکراتی ہے تو وہ منہ بسور لیتے ہیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے اور نورِ مسرت سے محروم آنکھیں صاف بتا رہی ہوتی ہیں کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی آرزوؤں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں!

حسنِ فطرت

ادب، موسیقی، آرٹ، سائنس، زیبائش وآرائش کے شگفتہ اسباب وذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔ دین کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے آتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح انداز میں رکھی گئی ہے۔ جب ہر شے اپنے مقام پر رہے تو اس کا ماحصل حسنِ کائنات ہوتا ہے۔ اس حسن (موزونیت) کے قیام وافزائش کے لئے، اور نور اور ابلیس کی بھی اپنے مقام پر ضرورت ہوتی ہے کہ حسن کی جلال آفرینیاں اور شعلہ انگیزیاں اسی کے ردِعمل سے جلوہ تاب ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ شر بن جاتی ہے۔ حسن موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ (پسکال کے الفاظ میں) اگر قلوپطرا کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخی دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ دین یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے موٹر کار میں، پٹرول کے ساتھ موبل آئل بھی لابدیفک ہے۔ خیر اس وقت پیدا

سلہ علامہ اقبال اسے ... (ECONOMISING HUMAN EFFORTS) کہتے ہیں۔

ہوتا ہے جب موبل آئل پٹرول کے ٹینک میں بھر دیا جائے۔ پھر گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

حدود اللہ اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ آپ قرآن میں دیکھئے۔ صرف چند چیزیں ہیں جنھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔ اس میں اوامر و نواہی کی فہرست نہایت مختصر ہے۔ باقی امور کے متعلق صرف حدود (BOUNDARY LINES) کھینچ دی گئی ہیں اور انسانی فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنی دنیا، اپنی صوابدید کے مطابق آپ پیدا اور آباد کرے۔ قرآن، حریتِ فکر پر کم از کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا مقصود انسانی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ قد افلح من زکھا (جس نے نفسِ انسانی کی صلاحیتوں کو ابھارا اس کی کھیتی ثمر بار ہوئی)۔ اس کے برعکس مذہب کو دیکھئے تو وہ انسانی زندگی کے ایک ایک سانس پر داروغے مقرر کر دیتا ہے۔ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ بچہ کی پیدائش سے لیکر انسان کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد تک بھی) ایک ایک قدم پر اپنا حکم نافذ کرتا رہتا ہے۔ دایاں قدم اٹھاؤ، تو یہ کرو۔ بایاں اٹھاؤ تو یہ پڑھو۔ پانی پیو تو یوں کرو۔ روٹی کھاؤ تو یہ کرو۔

حرام و حلال جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا تھا لیکن مذہب میں حلال اور حرام کی فہرستوں کو دیکھو کتابوں پر کتابیں بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ قرآن میں "مردار، بہتے ہوئے لہو، لحم خنزیر اور غیر اللہ کی طرف منسوب کردہ اشیاء" کو حرام قرار دینے[1] کے بعد فرمایا ہے کہ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب (۱۶/۱۱۶) "اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جھوٹی بات آجائے اسے بے دھڑک کہہ دیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ چیز حرام۔ اس طرح (حرام حلال ٹھہرانا) اللہ پر افترا پردازی ہے (اس لئے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرانا تھا، وہ اس نے حرام قرار دیدی ہیں) کسی شے کو انسانوں کیلئے حرام قرار دیدینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی آزادی کو بری طرح سے جکڑنا ہے۔ اس لئے دین میں یہ اختیار کسی انسان کو نہیں دیا جاتا۔ اس کا اعلان ہے کہ

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق (۷/۳۲)

ان سے پوچھ کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟

یعنی خدا کہتا ہے کہ ہمارے سوا اور کون ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دے سکتا ہے[2]؟ مذہب کے اجارہ دار خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو انھیں حرام قرار دیتے ہیں؟ وہ خدا سے علی الرغم کہتے ہیں کہ تم اپنی حرام کردہ چیزوں کی فہرست کو دیکھو اور پھر ہماری فہرستوں پر نگاہ ڈالو۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ حرام قرار دینے کے اختیارات کس کے وسیع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دین جب ملوکیت اور مذہب میں بٹ جاتا ہے تو وہ اختیارات جو خدا نے صرف اپنے قانون تک محدود رکھے تھے، انسانی ہاتھوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ارباب حکومت اپنے دائرہ میں۔ انسانوں کو اپنا محکوم بناتے ہیں۔ اور ارباب مذہب اپنے دائرہ میں انہیں اپنے تابع فرمان رکھتے ہیں۔ یہ حرام، وہ حلال۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ سب مذہب کے استبدادی فرامین ہیں جو شاہی احکامات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی گرفت کی شدت میں ان سے بھی زیادہ محکم۔ اس لئے کہ شاہی فرامین کا اثر تو وقتی ہوتا ہے لیکن مذہب کا استبداد دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب کا غلبہ و تسلط ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ تخت و تاج کی حکومت میں وہ لذت کہاں جو مسانید فتاویٰ کی حکومت میں ہے۔

---

[1] ان اشیاء کی حرمت کی کیا وجہ ہے، اس کے متعلق کسی اور موقعہ پر لکھا جائے گا۔

[2] قرآن تو رسولؐ کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ "تا بدیگراں چہ رسد!

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ عطا کیا تھا۔ دین کا نظام اس اختیار و ارادہ میں وسعتیں عطا کرتا اور اس سے ایسے نتائج پیدا کراتا تھا جن سے انسانیت کو عروج و ارتقاء حاصل ہو۔ مذہب اپنے استبدادی احکام سے اس اختیار و ارادہ کو کچلتا ہے۔ لہٰذا مذہب یکسر غیر انسانی زندگی بسر کرنے کیلئے مجبور کرتا ہے۔ جب آپ خلافِ انسانیت زندگی پر مجبور کئے جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

(۱) یا تو آپ کی انسانیت مسخ ہو جائے گی اور آپ شرفِ اختیار و ارادہ کو چھوڑ کر جمادات و نباتات کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ (مذہب میں قوم کی اکثریت کی یہی حالت ہو جاتی ہے اس لئے وہ تقلید پر رضامند ہو جاتے ہیں)

(۲) یا آپ ان مستبدانہ پابندیوں سے ایسی سرکشی اختیار کر جائیں گے کہ پھر آپ ان حدود کا بھی احترام نہیں کریں گے جو دین نے نظامِ انسانیت میں ربط و ضبط پیدا کرنے کے لئے اصولی طور پر متعین کئے ہیں (اس قسم کے سرکش و بے باک انسان بالعموم مذہب گزیدہ ہوتے ہیں)

(۳) اور یا پھر منافقت کی زندگی بسر کریں گے۔

منافقت شق سوم ذرا تفصیل طلب ہے جس طرح ملوکیت کے استبداد میں منافقانہ زندگی، خوشامد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح مذہب کی دنیا میں منافقانہ زندگی بھی خوشامدانہ مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں خدا کا تصور ایک جابر و مستبد بادشاہ کا سا قائم ہو جاتا ہے جس سے انسان ڈرتا ہے، خوف کھاتا ہے، اس لئے اسے خوش رکھنے کے لئے اس کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے حضور چڑھاوے چڑھاتا ہے (مذہب میں نماز، روزہ، صدقہ، خیرات اسی خوشامدانہ مسلک کے مظاہر بن جاتے ہیں) اور اس طرح انسان بزعمِ خویش خدا کو خوش کر لیتا ہے۔ اب رہیں مذہب کی غیر فطری پابندیاں۔ انھیں توڑنے کیلئے اس کا جی للچاتا ہے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے علانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے لئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے۔ وہ حسنِ فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز نہیں ہوتا، کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن مزامیر (سازوں) کے بغیر سن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابلِ نفرت شے ہے لیکن "ہاف ٹون تصویر"[1] اتروا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصور تک بھی اس کے نزدیک جہنم میں پہنچا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن وہ ایک "معشوقِ حقیقی" کی فریب انگیز اصطلاح میں حسن کی شعبدہ کاریوں اور بارۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرور آور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تعیش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات، نفسیاتی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے غیر فطری دباؤ (REPRESSION) سے جنسی بدنہادی (SEX PERVERSION[2]) پیدا ہو جاتی ہے جس کے مظاہر بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ اسی جنسی بدنہادی کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدعی دھڑا دھڑ شادیاں کئے چلے جاتے ہیں اور بے حد و شمار لونڈیوں سے متمتع ہونا عین

---

[1] تصویر کے مسئلہ پر ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک نامور مذہبی ہستی نے تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اوپر کے دھڑ (BUST) کی تصویر اتروانا جائز ہے (اس لئے کہ اس وقت تک ان کی اپنی تصویریں شاید اسی انداز کی اتری ہوں گی) انھیں ذرا ماڈرن بننے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے "آدھے دھڑ" کی بجائے انگریزی کی اصطلاح استعمال کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انھوں نے "ہاف ٹون" لکھ کر اپنی انگریزی دانی کا مضحکہ اڑایا تھا۔

[2] (SEX PERVERSION) کے لئے کوئی موزوں لفظ اسوقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ بدنہادی اس کا پورا پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مسخ شدہ فطرت، یا غیر فطری راہوں پر چل نکلنا اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ بھی (PERVERSION) کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ خواہش کی مکروہ ترین شکل ہوتی ہے۔

"شریعت حقہ" کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ آپ کتب فقہ و روایات کو دیکھئے۔ ان کا کتنا بڑا حصہ جنسیات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ان کا ذکر ایسی تفاصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر بے حیائی کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔ دین نے صرف وہ پابندیاں عائد کی تھیں جو انسانی معاشرے کے نظم و ضبط کے لئے لاینفک تھیں۔ اور ان کا نتیجہ غیر فطری دباؤ نہیں بلکہ دریا کو طغیانیوں سے بچانے کے لئے اس کے ساحلوں کا تعین تھا۔ مذہب نے اپنے غیر فطری استبداد سے اس دریا کے سامنے بند لگا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پانی زمین دوز راہوں میں جا چھپا اور جہاں جہاں سے نرم زمین دکھائی دی وہیں سے سر نکال لیا کہ ابھار پانی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ آپ اس تقاضے کو روک نہیں سکتے۔

پری رُو تابِ مستوری ندارد　　چو در بندی ز روزن سر برآرد

جن تباہیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ تھیں جو مذہب نے خارجی دنیا میں پیدا کیں۔ اور جو خرابیاں اوپر مذکور ہیں وہ ہیں جو اس کی وجہ سے دلوں کی داخلی دنیا میں وجود پذیر ہوئیں۔ ان خرابیوں نے پوری قوم کی سیرت کو مسخ کر دیا۔ جب کوئی قوم ایک عرصہ تک اس قسم کی منافقانہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو جائے تو اس قوم سے جرأت و جسارت اور کشادگی و شگفتگی کے جوہر سلب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ پست حوصلگی اور دون ہمتی، تنگ نظری **مذہبی ضابطۂ اخلاق** اور کوتاہ دامنی کے دنائت انگیز عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب ان عیوب کو محاسن بنا کر دکھانے کے لئے ایک اور حربہ استعمال کرتا ہے، جسے وہ ضابطۂ اخلاق کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عاجزی اور ناتوانی کو خدا کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے۔ پست حوصلگی اور دون ہمتی کا نام صبر اور توکل رکھتا ہے۔ فاقہ زدگی کو استغناء کے پرفریب نقاب میں چھپاتا ہے۔ بے عملی کی افیون کو تقدیر الٰہی کا تریاق بنا کر دکھاتا ہے۔ بزدلی کا نام "رنجاں مرنج" مسلک حیات رکھ دیتا ہے۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ ہر وہ فساد انگیز قوت جو رزق کے سرچشموں کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، اس قابل ہے کہ اس کی گردن مروڑ دی جائے۔ مذہب کا ضابطۂ اخلاق اس قسم کی لوٹ کھسوٹ کو "ھذا من فضل ربی" کہہ کر ان ناہمواریوں اور دستبردوں کو کھلا لائسنس عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ مذہب کا دائرہ اثر و نفوذ زیادہ تر غریب طبقے تک محدود رہتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں سے وہ اپنے ضابطۂ اخلاق کو نہایت آسانی سے منوا لیتا ہے۔ باقی رہے اس ضابطہ کے لپیٹے گوشے جن کا تعلق بالادست طبقے سے ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں امور دنیاوی کا نظم و انصرام ہوتا ہے۔ تو وہ انھیں وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ ظلم کرنا برا ہے۔ غریبوں کو ستانا اچھا نہیں۔ ہر حقدار کو اس کا حق دینا ضروری ہے۔ سائل کو رد نہیں کرنا چاہیئے۔ محتاج کو دھتکارنا معیوب ہے۔ مذہب اس باب میں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے کہ بالادست طبقہ کو اس قسم کے وعظ کہتے رہنا ضروری ہے۔ اس کا نام اس نے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" رکھ لیا ہے۔ جب بالادست طبقے کی طرف سے مفلوک الحال محتاجوں کی طرف کوئی بھیک کا ٹکڑا آپڑتا ہے تو مذہب ان کی شان میں قصیدے کہنے شروع کر دیتا ہے اور ان غریبوں اور محتاجوں کو جن کے حقوق کے غصب و نہب سے ان بالادستوں کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے خود ساختہ پرفریب مفہوم سے عمر بھر دعائیں دینے اور ان غاصبین کا بے دام غلام بنا رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ ہے اس ضابطۂ اخلاق کی حقیقت جو مذہب کا عروۃ الوثقیٰ ہوتا ہے اور جسے وہ نہایت بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کے متعین کردہ نظام (دین) کے ضابطہ کی ایک شق کی مثل کوئی قانون مرتب کر کے دکھاؤ اور دنیا ایسا قانون مرتب کر کے نہیں دکھا سکتی جس میں معاشی نظام حیات، مستقل اقدار سماوی سے اس طرح ہم آہنگ ہو۔ اس لئے دین اپنے نظام میں بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن مذہب جس ضابطۂ اخلاق کو پیش کرتا ہے وہ دنیا کی ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مذہب کا یہ دعویٰ کہ وہ دوسرے مذہب پر فوقیت رکھتا ہے، بالبداہت باطل ہوتا ہے۔ اسی لئے ابوالکلام صاحب آزاد نے مسلک گاندھوی کی تائید میں اپنے پورے زور خطابت کے ساتھ لکھا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

ان "عالمگیر سچائیوں" سے مراد یہی ضابطہ اخلاق تھا۔ یعنی جھوٹ نہ بولو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ غریب کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ۔ یہ سچائیاں واقعی تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس میں تو بلکہ مذہب کی بھی تخصیص نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو لامذہب کہتے ہیں اور خدا کی ہستی تک کے بھی قائل نہیں وہ بھی ان "عالمگیر سچائیوں" کے معترف ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا بڑا مستحسن فعل ہے لہذا اگر اسلام بھی صرف وہی ضابطہ اخلاق پیش کرتا ہے تو اس کے اس دعوے کے معنی کیا ہیں کہ میری پیش کردہ تعلیم کی ایک شق کی مثل بھی کوئی انسان پیش نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی پیش کردہ تعلیم اس عام اخلاقی ضابطہ سے ماورا کچھ ہے جس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ یہ تعلیم ہے وہ نظام ربوبیت جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور جس کی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا (اس کی تفصیل میں اپنے اکثر مضامین میں پیش کر چکا ہوں) عام ضابطہ اخلاق[1] اس نظام کی تمہیدات میں آجاتا ہے۔

دین نظام زندگی پیش کرتا ہے۔ لیکن مذہب کے پاس یہی پیش پا افتادہ ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ چند رسوم۔ مذہب پرستوں کا ایک طبقہ (جسے تصوف والے اہل شریعت کہہ کر پکارتے ہیں) . . . . . اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے مذاہب سے برسرپیکار رہنے میں ہی اپنی بقا کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس ضابطہ اخلاق سے قطع نظر کر کے غیر مذاہب والوں سے اپنے رسوم و مناسک کے اصلح و انفع ہونے پر مناظرے اور مباحثے کرتا رہتا ہے۔ لیکن مذہب کا دوسرا گوشہ، جسے تصوف کہتے ہیں، ان رسوم و مناسک کی اہمیت کو کم کر کے دوسرے مذاہب سے ضابطہ اخلاق کے اشتراک پر آمادۂ مفاہمت ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ مفاہمت ایسی یک رنگ ہو جاتی ہے کہ رام اور رحیم ایک ہی سکہ کی دو طرفیں قرار پا جاتی ہیں چونکہ تصوف کی دنیا تخیلات کی پیدا کردہ ہے اس لئے شاعری اسے خوب ہوا دیتی ہے۔ تصوف، شاعری کے لئے نہایت وسیع میدان پیدا کرتا ہے اور شاعری تصوف کو حقیقت بنانے کے لئے وہ "دلائل" بہم پہنچاتی ہے جن کی حقیقت تشبیہات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ شاعری بے عمل قوم کے لئے زندگی کا پرسکون بہانہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ، شاعری ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے تصور ہی تصور میں زندگی کے مختلف مراحل و مدارج طے کئے جاتی ہے

---

[1] قرآن نے مومنین کی صفات عالیہ کے لئے اخلاق کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ یہ اصطلاح بعد میں علم الاخلاق کے معلمین کی وضع کردہ ہے جنہوں نے اسے (ETHICS) یا (MORALS) کے مفہوم کے لئے وضع کیا۔ قرآن میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وانک لعلی خلق عظیم (۶۸/۴)۔ (یعنی آپ خلق عظیم پر ہیں)۔ خلق اور خلق کا مادہ ایک ہی ہے۔ خلق کے معنی توازن قائم کرنا ہے۔ . . . . . (یہ CREATION) کے مفہوم سے الگ ہے۔ CREATOR کے لئے قرآن نے بدیع (السموات والارض) کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ORIGINATOR ہیں۔ لہذا خلق کے معنی توازن کے ہیں۔ خلیق متوازن کو کہتے ہیں۔ اس لئے حضورؐ کے متعلق جب فرمایا کہ انک لعلی خلق عظیم تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ آپ میں مختلف انسانی قوتیں اپنے انتہائی توازن کو لئے ہوئے ہیں۔ اور یہی انسانیت کا کمال ہے۔ اس سے بلند (اور مکمل) توازن ذات خداوندی میں ملتا ہے جہاں تمام قوتیں (جنہیں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے) اپنے انتہائی توازن کے ساتھ مجتمع ہیں۔ اسماء کے ساتھ لفظ حسنیٰ اسی توازن کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ حسن نام ہی توازن کا ہے

نبی اکرمؐ نے جس قرآنی نظام ربوبیت کو قائم فرمایا وہ اسماء الحسنیٰ ہی کے توازن کا عکس اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس جہت سے بھی حضورؐ خلق عظیم پر تھے۔ یعنی اس نظام کے حامل جو انتہائی توازن لئے ہوئے ہے۔

خلق کے اس مفہوم اور اخلاق (MORALS) کے عام مفہوم میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ دین نظام خلق (متوازن نظام) کو پیش کرتا ہے اور مذہب اس ضابطہ اخلاق کو جو ہر جگہ یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

جب کبھی زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے، اس کے لئے کسی شاعر کا برجستہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

مذہب اس سادہ لوح قوم کو اس طرح نظریات میں الجھائے رکھتا ہے اور ملوکیت کو کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔

کفر بعد از ایمان

جب قرآن کا لاہوادین (عملی نظامِ حیات) مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ تمام جیتے جاگتے نتائج جو اس نظام کا فطری نتیجہ تھے، معدوم ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ نتائج، قانون کے ساتھ وابستہ ہیں، کسی قوم کے نام یا اس کی تراش خراش کے ساتھ نہیں۔ لہٰذا جب اس قوم نے جو اس ضابطۂ حیات کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی، اسے ضابطۂ زندگی ماننے سے عملاً انکار کر دیا تو اس پر کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں مسدود ہو گئیں دیکھئے! قرآن نے اس حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانھم۔ بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج و ارتقار کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد پھر اس سے (عملاً) انکار کر دے۔

وشھدوا ان الرسول حقٌ۔ درآنحالیکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس نظامِ حیات پر عمل کرنے والے رسول کی جدوجہد نے کیسے تعمیری نتائج پیدا کئے تھے (حق)

وجاءھم البینات۔ اور اس طرح اس نظامِ زندگی کی واضح دلیلیں اس کے سامنے روشن ہو گئی تھیں۔

واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ اللہ کا قانون اس قوم پر عروج و ارتقار کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ پر نہیں رہنے دیتی (ظلم[1])

اولئک جزاءھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین (۳/۸۶-۸۷)۔ ان لوگوں کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائج حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون، اس قانون کو ٹھوس حقائق میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔

ان آیات سے یونہی نہ گزر جائیے۔ یہ ایک عظیم الشان قانون کو بیان کرتی ہیں۔ "کفر بعد از ایمان" وہی ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ الذین جعلوا القرآن عضین (۱۵/۹۱)" وہ لوگ جنھوں نے قرآن کے الگ الگ ٹکڑے کر دیئے"۔ اس نظامِ واحد کو دنیا اور آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح ملوکیت اور مذہب وجود میں آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دین کے نظام کے تمام ٹھوس نتائج سے محروم رہ گئے۔ ملوکیت اور مذہب، دونوں دین ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ ان دونوں میں دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ پانی کی مثال پر پھر غور کیجئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ بجھاتا ہے۔ لیکن

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشیئ فی غیر موضعہ المختص بہ (راغب) یعنی کسی شے کا اس مقام پر نہ رکھا جانا جو اس کے لئے مختص ہے جب کسی نظام کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر نہ رہنے دیئے جائیں تو اس سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے جس کا نام فساد یا سوء ہے جو حسن یا اصلاح کی ضد ہے۔ قرآن نے سورۂ نمل میں ظلم کو سوء سے تعبیر کر کے حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ دیکھئے (۲۷/۱۱)

اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو جب الگ الگ کر دیا جائے اور پانی کا قطرہ اس طرح، ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے تو ان اجزاء کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (آگ کو بجھانا تو ایک طرف) ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا سامان بہم پہنچاتی ہے (کوئی چیز آکسیجن کے بغیر جلتی نہیں)۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جزو میں بھی پانی کی خاصیت (PROPERTY) باقی نہیں رہتی بلکہ اس کے برعکس خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دین، جب الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو اس کے دونوں ٹکڑوں (حکومت اور مذہب) میں سے کسی میں بھی دین کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ان کی خصوصیات، دین کی خصوصیات کی ضد ہوتی ہیں۔ دین، وحدت پیدا کرنے آیا تھا۔ ملوکیت اور مذہب نے، ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور یہ قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ تھا (جسے عذاب کہا جاتا ہے)۔

قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا ویذیق بعضکم بأس بعض۔ انظر کیف نصرف الآیات لعلھم یفقھون (۶/۶۵)

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس پر قادر ہے کہ (اس کی خلاف ورزی کرنے سے) تم پر خارجی دنیا سے عذاب لے آئے یا داخلی دنیا (تمہارے پاؤں کے نیچے) سے۔ یا تم گروہوں میں بٹ کر خلط ملط ہو جاؤ (اور اس طرح تمہاری وحدت ختم ہو جائے) اور تم ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار ہو جاؤ۔ دیکھو: ہم کس طرح (تاریخی شہادات سے) ان حقائق کو پھیر پھیر کر تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔

اربابِ مذہب، نتائج کو اعمال سے اتنا دور لے گئے کہ انھوں نے سب کچھ "آخرت" پر اٹھا رکھا۔ اس لئے ان کا دنیا میں کچھ حصہ نہ رہا۔ اہلِ حکومت نے اپنی تمام توجہات قریبی مفاد (دنیا) پر ہی مرتکز کر دیں۔ اس لئے ان کا حال تو خوشگوار ہو گیا۔ لیکن مستقبل روشن نہ ہو سکا۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد ان سے حکومت و سلطنت بھی چھن گئی۔ غور کیجئے۔ قرآن نے حال (دنیا) اور مستقبل (آخرت) کے اس فرق کو کسقدر نمایاں، اور حال کے پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھنے والوں کے مآل کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض۔ ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاٰخرۃ۔ فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل (۹/۳۸)

اے وہ جو ایمان کے دعویدار ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ[1] میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا تم مستقبل سے بے فکر ہو کر قریبی مفاد کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو (تم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ) قریبی مفاد تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

اگر تم اس روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

الا تنفروا یعذبکم عذابًا الیمًا ویستبدل قومًا غیرکم ولا تضروہ شیئًا واللہ علیٰ کل شئ قدیر (۹/۳۹)

اگر تم نے (مستقبل کی تابناکی کے لئے) قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھو خدا کا قانون تمہیں اس کی بڑی دردناک سزا دے گا۔ یعنی تمہاری جگہ وہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم (اس انحراف سے) خدا (کے قانون) کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے (خود ہی تباہ ہو گے)۔ اللہ کا قانون ہر عمل کو اس کے نتیجہ کے ساتھ موافق کر دیتا ہے۔ (قدر)

---

[1] فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ) کے قرآنی مفہوم کے لئے آپ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا ہو گا۔ سردست اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن اس اصطلاح کو بالعموم اجتماعی نظام کے لئے استعمال کرتا ہے جس کی بنیادیں مستقل اقدار (وحی) پر ہوں۔

چنانچہ اس طرح، رفتہ رفتہ ان کی وسیع و عریض حکومتیں یا ختم ہوگئیں یا سمٹ سمٹا کر چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں میں تبدیل ہوگئیں جن کی بقا آج دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ جب تک اقوامِ مغرب کی سیاسی مصلحت کوشیوں کا تقاضا ہو یہ جاگیرداریاں قائم رہیں گی۔ جب ان کے مصالح کا تقاضا دوسرا ہوا انہیں ختم کر دیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں سلطنتیں مٹتی گئیں (یعنی امورِ دنیا دوسروں کے ہاتھوں میں چلے گئے)، قوم زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بنتی گئی۔ چنانچہ آج ساری دنیا کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جہاں جہاں ان کی حکومتیں باقی ہیں، ملوکیت اپنی بدترین شکل میں موجود ہے۔ اور جہاں حکومتیں ختم ہوگئی ہیں وہاں مذہبیت اپنے جذام کو لئے ہوئے ان پر مسلط ہے۔ حکومتیں آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور مذہب پرست گروہ آپس میں نبرد آزما۔ ان کا تمام معاشرہ، علمی سرمایہ، ان کے تصوراتِ حیات، ان کے نظریاتِ زندگی، سب کے سب افسردگی کے پیامبر دار ہیں اور موت کے نقیب۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام ۔۔۔ بتانِ عجم کے پجاری تمام

اور یہ اس لئے کہ

حقیقت، خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ امت، روایات میں کھو گئی

غور و تدبر قرآن نے مسلمانوں کو قدم قدم پر دعوتِ فکر دی تھی۔ زمین و آسمان میں فکر، انفس و آفاق میں فکر، دنیا اور آخرت میں فکر۔

كذالك يبين الله لكم الآيات لعلكم تتفكرون ○ فى الدنيا والآخرة (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔

اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر تم "عذاب النار" سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ارض و سما میں غور و فکر کرو۔ اس غور و تدبر سے تم اس قانونِ خداوندی کا مطالعہ کر سکو گے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اور جب تم یہ معلوم کر لو گے کہ کائنات میں کونسا قانون نافذ العمل ہے جس سے یہ محیر العقول سلسلہ اس قدر متوازن و ہموار، اپنی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتے جا رہا ہے، تو تم یہ بھی معلوم کر لو گے کہ تمہیں اپنی حیاتِ اجتماعیہ میں اس ہمہ گیر قانون کو کس طرح ایک مؤثر حقیقت بنانا ہے یہی "اللہ کے ذکر" سے مفہوم ہے۔

ان فى خلق السماوات والارض واختلاف الليل والنهار لآيات لاولى الالباب ○ الذين يذكرون الله قياما وقعودا وعلى جنوبهم ويتفكرون فى خلق السماوات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانك فقنا عذاب النار (۳/۱۹۰-۱۹۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض و سماوات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردشوں میں، اربابِ دانش و بینش کے لئے (ارتقاء کی سیدھی راہوں کے) نشانات ہیں۔ وہ اربابِ دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہمیشہ ارض و سماوات کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اور اس انداز کے گہرے تدبر و تفکر کے بعد اس حقیقت کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ کے نشو و نما دینے والے قانون نے کائنات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تخریبی پہلو تعمیری پہلوؤں پر غالب آجائے اور اس طرح اس دنیا کو جہنم بنا دیں۔ خدا کا تعمیری پروگرام ایسے تخریبی مآل سے کوسوں دور ہے۔

اس لئے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے واضح کر دی تھی کہ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں وہ اگر تعداد میں تھوڑے بھی ہوں تو بھی ان لوگوں کی اکثریت پر غالب رہتے ہیں جو سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔ وان يكن منكم مائة يغلبوا الفا من الذين كفروا بانهم قوم لا يفقهون (۸/۶۵)

"اگر تم میں سو آدمی بھی ایسے ہو گئے (جو سمجھ بوجھ سے کام لینے والے ہوں) تو وہ ہزار کافروں کو مغلوب کر کے رہیں گے۔ اس لئے کافروں کا گروہ ایسا ہے جو سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔" یہ ہے دنیا میں قوموں کی کامیابی کا راز۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم رہی انھوں نے اشیائے فطرت غور و فکر کرنا اور کائنات کی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنانا عین فریضۂ زندگی سمجھا لیکن جب مذہب کے تقلیدی مسلک نے ان کے قوائے فکریہ کو مفلوج کر دیا تو عقل و فکر سے کام لینا ان پر حرام ہو گیا۔

عالم کسے کہتے ہیں

قرآن نے عالم کا لفظ سائنٹسٹ (SCIENTIST) کے لئے استعمال کیا تھا۔ سورۂ فاطر میں دیکھئے کس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا:

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے؟

فاخرج بہ ثمرات مختلف الوانھا۔ اور اس پانی (اور مٹی کے امتزاج) سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کر دیتا ہے۔

ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود۔ اور پہاڑوں میں سرخ و سپید مختلف رنگوں کے خطے ہیں۔ اور بعض ان میں سے (سنگ موسیٰ کی سی) سیاہی لئے ہوئے ہیں۔

ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانھا۔ اور (نباتات و جمادات کی دنیا سے آگے بڑھئے تو) انسانوں اور حیوانوں کی دنیا میں غور کیجئے کہ یہ کس قدر انواع و اقسام کی دنیا ہے۔

کذلک انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ یہ کائنات اسی طرح پھیلی ہوئی ہے سو جو لوگ اس پر غور و فکر کے بعد اس کے متعلق علم حاصل کر لیتے ہیں، وہی قانونِ خداوندی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس کر سکتے ہیں۔

غور کیجئے۔ یہاں علماء کا لفظ استعمال ہی ان کے لئے ہوا ہے جو کائنات کے مختلف شعبوں پر غور و فکر کرتے ہیں (اسی کو سائنس کہتے ہیں) لہٰذا اس کا ترجمہ ہی سائنٹسٹ ہے۔ لیکن جب دین، مذہب سے بدل گیا تو علماء کے معنی لائبریرین کے رہ گئے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں نے مذہبی علماء کو لائبریرین کس طرح سے کہہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں سب سے بڑا عالم کون ہوتا ہے۔ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق، بخاری میں کیا لکھا ہے۔ فتح الباری نے اس کی تفسیر کیا بیان کی ہے۔ علامہ آلوسی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ درمختار میں اس کی بابت، حواشی سعدیہ، ہدایہ اور در سے کیا منقول ہے۔ صاحب نہایہ نے ذخیرہ سے کیا نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ علامہ شامی نے شیخ ابن ہمام سے کیا نقل کیا ہے۔ جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے[1] وہی سب سے بڑا "مفتیٔ دین" اور "عالم شرع متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟ چونکہ مذہب کی دنیا میں کسی معاملہ میں اپنی رائے کو دخل دینا سب سے بڑا جرم ہے اس لئے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ ہو گا جس میں کہیں عقل کی بُو نہ آنے پائے۔ اور یہ مسائل جن کے لئے ان ذخائر کتب کی اوراق گردانی و سطور شماری ہوتی ہے، ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک عزیز دوست گزشتہ حج کے لئے عازم ہوئے تو میں نے ان سے خاص طور پر کہا کہ وہ وہاں مختلف ممالک کے علماء سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ علم کو اگر مستقل اقدار سماوی (وحی) سے ہم آہنگ نہ کیا جائے، تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ سورۂ مومن میں ان اقوام سابقہ کے متعلق جو قوتوں اور ثروتوں کی مالک تھیں، فرمایا کہ فلما جاءتھم رسلھم بالبینات فرحوا بما عندھم من العلم "جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ واضح دلائل لیکر آئے تو انھوں نے یہ کہہ کر (منہ پھیر لیا) کہ جو کچھ ہمیں ہمارے علم نے دے رکھا ہے ہم اس پر مطمئن ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزؤن (۴۰/۸۳) "ان کو ان تباہیوں نے آدبوچا جنھیں وہ ایک استخفار آمیز ہنسی سے ٹال دیا کرتے تھے"۔ لہٰذا دین کا نظام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے مستقل اقدار سماوی (وحی) کے مطابق ان کا استعمال کیا جائے۔

مسائل و مباحث پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم و بیش تمام علمائے مکہ و مدینہ اور دیگر ممالک اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں۔ جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی وہ یہ تھے کہ جمع بین الصلوتین بالقصر فی عرفات والمزدلفہ (عرفہ اور مزدلفہ میں نمازوں میں قصر بالجمع) جائز ہے یا نہیں؟ قبروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ مرکز توجہ یہ مسئلہ عظیمہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالظاہر (امام حرم) اور شیخ عبدالمہیمن ابوالسمح (امام حرم) اور شیخ عبدالرزاق مدیر مدرسہ دار الحدیث مکہ مکرمہ اور مولانا شیخ عبدالرزاق العفیفی الازہری جیسے "علمائے کبار" سب کے سب اسی اہم مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ ڈاڑھیوں کے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب "امور دنیا" کو دنیا داروں کے سپرد کر دیا جائے تو اہل مذہب کے لئے اور کون سے مسائل رہ جاتے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ ان "علماء" میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو اپنے آپ کو غیر مقلد کہتا ہے۔ اس سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ شاید عقل و فکر سے کام لینے کے مدعی ہوں گے۔ لیکن یہ شبہ ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مقلد اور غیر مقلد فرقہ بندی کی اصطلاحیں ہیں۔ عقل و فکر سے تو دونوں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مقلد ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد روایات کی تقلید۔ مقلد ائمہ ہوں یا مقلد روایات، تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ یا ائمہ فقہؒ کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اللہؐ، صحابہ کبارؓ اور ائمہ فقہؒ تو کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ تو مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ لہٰذا ان کی اتباع تو یہ ہے کہ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل اسی طرح خود سوچئے جس طرح وہ حضرات خود سوچا کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ہزاروں برس سے اس نے سوچنا ترک کر رکھا ہو، کیا اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے؟ آبائی مسلک کا اثر کس قدر غیر مرئی بلکہ غیر محسوس اور کس درجہ گہرا اور تحت الشعور میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مختلف مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک مسلمان بچہ، گوشت کی طرف لپک کر جائیگا لیکن وہی گوشت ایک چینی کے لڑکے کے سامنے لائیے، اسے اس سے جھرجھری آجائے گی اور اس کی طبیعت متلانے لگے گی۔ اس کی طبیعت کا ایسا ردعمل کسی منطقی فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں عقل و شعور کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ طبیعت کا یہ ردعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دیکھئے قرآن نے جن چار چیزوں کو بہ نص صریح حرام قرار دیا ہے ان میں ایک وما اھل بہ لغیر اللہ (۲/۱۷۳) بھی ہے۔ یعنی ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ہمارے ہاں پیروں اور اولیاؤں کی نیازیں روز دی جاتی ہیں۔ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ان کی حرمت بہ نص صریح ثابت ہے لیکن چونکہ ہمارے گھروں میں ان کا عام رواج ہے، اس لئے ان نیازوں کو چھوٹے بڑے سب کھاتے ہیں اور طبیعت پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، چوہا چونکہ کھایا نہیں جاتا وہ اگر کھاتے وقت سامنے سے گذر جائے، یا اس کا ذکر تک بھی کر دیا تو متلی ہونے لگ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے شراب کے پیالے میں چوہیا گر جائے تو اس کے نزدیک وہ شراب بھی "حرام" ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے اٹھا پھینکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک چینی اس چوہیا کو مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ اور اس باب میں آپ کا ذہن کبھی اس طرف آنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق آپ کی طبیعت کا ردعمل، سوچ سمجھ کا نتیجہ ہونا چاہئے۔

انہی مثالوں سے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب ایک قوم اپنے آباؤ اجداد کے مسلک پر تقلیداً چلی جا رہی ہو تو واقعات و حوادث کے متعلق ان کا ردعمل کسی غور و تدبر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا ردعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جس بات کو غیر شعوری طور پر مستحسن مانتے چلے آرہے ہیں وہ مستحسن نظر آتی ہے اور جسے غیر شعوری طور پر مذموم سمجھتے چلے آرہے ہیں وہ مذموم

ہوتی ہے۔ نہ اُسے مستحسن سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی واقعی دلیل ہوتی ہے نہ اسے مذموم سمجھنے کے لئے کوئی حقیقی برہان۔ مناظروں اور مباحثوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہیں اپنے مسلک کی "حقانیت" کے لئے دلائل تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن مناظرہ ہمیشہ فریقین کی ذاتی قابلیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر فریق اس "ایمان" کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اس کا مسلک عین حق و صداقت کا مسلک ہے اور فریق مقابل کا مسلک غوایت و ضلالت کی روش۔ اس "ایمان" کے بعد، ذاتی قابلیتوں کا تقابل ہوتا ہے۔ اور بس۔

مذہب پرست مسلمان کی یہ حالت ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں فکر نَو کا، کہ جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے، کہیں امکان بھی ہو سکتا ہے؟

معنئ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست　　مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن، مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے جس میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔ مسلمان کی آج حالت یہ ہے کہ

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق　　مکتب و مُلّائے او محروم شوق

جب کسی قوم کا ذہن اس طرح تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو تو عروج و ارتقا کی راہیں اسے نظر کس طرح آ سکتی ہیں؟ کظلمات فی بحر لجی یغشٰہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا ومن لم یجعل اللہ لہ نورًا فما لہ من نور (۲۴/۴۰)۔ جیسے سمندر کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پر لہر چڑھتی آ رہی ہو۔ داخلی دنیا کی تاریکیوں کا یہ عالم اور خارجی دنیا کی یہ کیفیت کہ آسمان پر گھنگور گھٹا چھا رہی ہو۔ اندھیرا ہے کہ اندھیرے کے اوپر چڑھتے جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف، خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی کیسے دے؟ دکھائی تو دینا تھا دین کی روشنی سے۔ جب دین خداوندی ہی روشنی نہ دے تو روشنی کہاں سے ملے؟ مذہب خود تاریکی ہے۔ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

یہ ہے حالت آج مسلمان کی۔ اس کی دنیا، ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بادشاہتیں، سرمایہ داریاں، جاگیرداریاں، زمینداریاں، غرضیکہ معاشی زندگی کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن نے فساد فی الارض کہہ کر پکارا ہے) سب اسی لعنتِ کبیرہ کے مظاہر ہیں۔

اور اس کی "آخرت" مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی، شریعت کے رسوم و مروجات، علم کلام کے نظری مباحث، تصوف کی فسوں کاریاں، سب اپنی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں۔ اور ان کے اندر جکڑا ہوا بیچارہ مسلمان، حسرت بھری نگاہوں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟

آں کہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست　　فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و مُلّا و پیر

اس ذہنی اور جسمانی استکراہ و استبداد کے بعد سینہ میں روشنی کی کرن کہاں سے آ سکتی ہے؟

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

زوال کا بنیادی سبب

یہ ہیں اسبابِ زوالِ امت۔ "اسباب" محض تفصیل کے اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب[1]۔ دنیا میں آج تک کسی مذہب پرست قوم نے ترقی نہیں کی۔ نظر دوڑا کر دیکھئے۔ یہ حقیقت ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے گی جس قدر کوئی قوم زیادہ مذہب پرست ہے اسی قدر وہ دنیاوی ترقیوں میں پست تر زبوں حال ہے۔ تبت کے لاموں کے پیرو اور چین کے بدھ مت کے تبع پورے کے پورے مذہب میں ڈوبے ہوتے ہیں، ان کی حالت ظاہر ہے۔ جن قوموں میں ایک طبقہ مذہب پرست ہوتا ہے اور دوسرا دنیادار، ان کا مذہب پرست گروہ، دنیادار طبقہ سے پست حال رہا ہے۔ ہندوستان میں سناتن دھرمی فرقہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ خود یورپ میں عیسائی خانقاہوں کے مذہب پرست گروہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ دنیا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ ایسا کر دیتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ کے افراد، اُدھر سے کٹ کٹ کر، دنیاداروں کی طرف آجاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس قوم کی اکثریت "دنیاداروں" کی ہو جاتی ہے اور مذہب، عبادت گاہوں کی چاردیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جیسے آج کل یورپ میں عام طور پر ہو رہا ہے۔ جب یہ تھپیڑے اور شدت اختیار کر لیتے ہیں تو مذہب کو خارج البلد کر دیا جاتا ہے اور پوری کی پوری قوم خالص "دنیادار" ہو جاتی ہے۔ جیسے (کہتے ہیں کہ) روس میں ہوا ہے (یا کم از کم مارکس کے فلسفہ کا دعویٰ ہے) یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ ان کی اکثریت مذہب پرست ہے اس لئے پست و زبوں حال، جو کچھ مذہب نے دوسری جگہ کیا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ دیکھئے اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن کریم نے کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا یہ پیغام نوعِ انسانی کے لئے یکسر ہدایت و رحمت ہے لیکن

یضل بہ کثیرًا ویھدی بہ کثیرًا (۲/۲۶)

اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔

قرآن ہی کے قانون کے مطابق تباہی

اس آیت جلیلہ پر غور کیجئے۔ خدا کہتا ہے کہ اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔ وہی پانی جو زندگی کی اساس ہے، انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ یہ کون ہیں جن کے حصہ میں اسی قرآن سے بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ وما یضل بہ الا الفاسقین۔ گمراہی فاسقین کے حصہ میں آئے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فاسقین کون ہیں؟ وہ کہتا ہے الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ" وہ لوگ جنھوں نے قانونِ خداوندی (سنۃ اللہ) کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا عہد کیا لیکن اس کے بعد اس عہد کو توڑ دیا۔" اس کی مزید وضاحت ان الفاظ سے فرمادی کہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل" ہاں! یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس چیز کے ٹکڑے کر دیئے جسے ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا۔" خدا کے قانون نے یہ بتایا تھا کہ حیات ایک غیر منقطع وحدت ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی۔ طول میں دنیا اور آخرت، حال اور مستقبل میں کوئی حد فاصل نہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل جوئے رواں چلی جاتی ہے۔ اس لئے دنیا اور آخرت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ ضوابطِ زندگی تجویز کرنا فسق ہے، شرک ہے۔ اسی طرح، عرض کی طرف وحدتِ انسانیت کے بجائے، انسانوں کو افراد، شعوب، قبائل، اقوام میں تقسیم کر کے حد بندیاں قائم کر دینا بھی اس وحدت کا قطع کر دینا ہے اور یہ فسق ہے۔ اس فسق و شرک کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی (ویفسدون فی الارض) اور ایسی قوم کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت نامراد و ناکام رہے گی۔ (اولئک ھم الخاسرون ۲/۲۶)۔

---

[1] اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونے دیں کہ اسلام، دین ہے مذہب نہیں۔ مذہب بعد کی پیداوار ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی وہ ہیں جن کا ذکر سابقہ صفحات میں آچکا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ان مختصر سی آیات میں کتنے اہم اساسی قانونِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین کا نظامِ حیات کی وحدت کو عملاً قائم رکھنے کے لئے آیا تھا۔ یہ وہ نظام تھا جس کا نتیجہ اصلاح فی الارض (معاشی زندگی میں ہمواریاں) اور حسنِ مآب (مستقبل کی خوش گواریاں) تھا۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ہدایت ہے۔ اس کے بعد قرآن کی حامل قوم نے اس وحدت کے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے بھی ٹکڑے کر دیئے۔ ایک حصہ کو دنیا سے متعلق سمجھ کر حقوق العباد قرار دے لیا اور دوسرے حصہ کو آخرت سے چپکا کر حقوق اللہ نام رکھ لیا۔ اس کا نتیجہ فساد فی الارض (حال کی تباہی) اور خسران فی الآخرت (مستقبل کی بربادی) تھا۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ضلالت ہے۔ قرآن وہی تھا لیکن اب وہ سرچشمۂ ہدایت ہونے کے بجائے موجبِ ضلالت بن گیا۔ دین میں قرآن ضابطۂ حیات تھا۔ مذہب میں پہنچ کر قرآن مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔ یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ ہزار برس سے یہ قوم بظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے لیکن اس قرآن سے انہیں سوائے ضلالت اور خسران کے اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کائنات کا قانون یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر ہی اپنے مضمر فوائد سے متمتع کر سکتی ہے۔ اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے، وہی شے ضرر انگیز ہو جائے گی۔ پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے وہی پانی کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اسے کشتی کے اوپر لے آیئے وہی پانی سیلاب بلا بن کر کشتی کو لے ڈوبے گا۔ کسی شے کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بتا دیا کہ ظالمین کے لئے قرآن میں ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ وننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمت للمومنین۔ "اور ہم نے قرآن میں جو کچھ نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے شفا و رحمت ہے۔" ولا یزید الظالمین الا خسارا (۱۷/۸۲) لیکن جو اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیں گے ان کے لئے اس میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمان کے کاروبارِ زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہو گیا۔ قرآن وہی ہے، اس کا مقام بدل گیا ہے۔

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم | جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر!
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز | تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا | کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسبابِ زوال آپ کے سامنے آ گئے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس زوال کو عروج سے بدلنے کی راہیں کون سی ہیں۔ بات صاف ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اس وقت مسلمانوں کی سمجھ میں شاید ہی آئے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے | ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہئے

پس چہ باید کرد؟

بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو "مذہب" چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک (SCRUPLES) ان کے عناں گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوامِ عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔ موت تو آئے گی لیکن وہ اس قسم کے تپِ دق اور جذام کی سسکیوں سے تو اچھی ہوگی۔ اور دوسرا راستہ یہ کہ مذہب کو چھوڑ کر دین کو اختیار کر لیا جائے۔ اس میں قریبی مفاد بھی اس انداز کے ہوں گے کہ دنیا کی دوسری قومیں اس پر رشک کریں گی، اور اس کے بعد مستقبل بھی ایسا روشن اور تابناک ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربھا (زمین اپنے نشو و نما دینے والے خدا کے نور سے جگمگا اٹھی)

کا درخشندہ منظر سامنے آجائے گا۔ قرآن نے دین کے نظام کی سمٹی ہوئی صورت (CRYSTALLISED FORM)
کو نظامِ صلوٰۃ[۵۱] کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ صلوٰۃ کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اب سورۂ مریم کی ان آیات کو پڑھیے جن میں پہلے اُس ہدایت یافتہ اور منعم علیہ گروہ کا ذکر ہے جسے دین کے نظام نے علو مدارج عطا کیا تھا (ورفعنہ مکانا علیا) اور اس کے بعد فرمایا ہے:

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا (۱۹/۵۹)

پھر اس گروہ کے بعد ان کے جانشین ایسے پیدا ہوگئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ یعنی وہ اپنی پسندیدگیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

غور کیجئے۔ قرآن نے ہماری حالت کا کس قدر صحیح نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا جس قوم نے نظامِ صلوٰۃ ضائع کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی یا اس کی بعث بعد الموت (موت کے بعد دوبارہ زندگی' نشاۃِ ثانیہ) کا بھی امکان ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اگر اس قوم میں صلاحیت کی ہر استعداد یکسر ختم نہیں ہوگئی تو اس کی نشاۃِ ثانیہ کا امکان ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا ضابطہ اپنی محفوظ شکل میں دنیا میں موجود ہے۔ اس بازآفرینی کی صورت یہ ہے کہ جہاں سے صحیح شاہراہِ زندگی (صراطِ مستقیم) چھوڑ کر ایک غلط راستہ اختیار کر لیا تھا' انہی قدموں پر واپس لوٹ کر پھر اسی مقام پر آجائیے (اسے توبہ کہتے ہیں)۔

الا من تاب وعمل صالحا فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئا (۱۹/۶۰)

لیکن (اس کے بعد بھی) جو قوم پھر پچھلے پاؤں لوٹ جائے اور اصل راستہ پر پہنچ کر پھر وہ نظامِ عمل اختیار کرے جس کا نتیجہ زندگی کی ہمواریاں (عملِ صالح) ہیں' تو یہ قوم پھر اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پالے گی اور پھر ان کی کوششیں اپنا پورا پورا نتیجہ پیدا کرنے لگ جائیں گی۔

کون سی فردوسِ گم گشتہ؟

جنت عدن التی وعد الرحمان عبادہ بالغیب انہ کان وعدہ ماتیا (۱۹/۶۱)

وہ ہمیشہ رہنے والی جنت (جس کی بہار میں خزاں نہیں اور) جس کا وعدہ خدائے رحمان نے اپنے ان بندوں سے کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق کوششوں کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں۔ یقیناً اس کا وعدہ (قانون کا نتیجہ) ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آگئی۔

ہاں! وہ جنت

لا یسمعون فیھا لغوا[۵۲] الا سلاما۔ (۱۹/۶۲)

جس میں بے معنی باتوں (کی شاعری) نہیں ہوگی۔ ہر بات ایسی ہوگی جو کمیوں (DEFICIENCIES) کو پورا کر کے انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دے۔[۵۳]

---

[۵۱] مذہب میں اسی نظامِ صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز کی رسم ادا کرنا رہ گیا۔ جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ دین کے نظام کا صحیح عکس نظامِ صلوٰۃ میں جھلمل جھلمل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظام کیا ہے اور اس میں کس طرح دین کا نظام منعکس ہوجاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے معارف القرآن کی آئندہ جلد کا انتظار فرمائیے۔ نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے اور کس طرح نماز' نظامِ صلوٰۃ کا ایک جزو بنتی ہے اس کے لئے طلوعِ اسلام بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مراسلات نیز میرا مضمون "عبادت" (مطبوعہ طلوعِ اسلام) ملاحظہ فرمائیے۔

[۵۲] لغو' چڑیوں اور پرندوں کی بے معنی بولیوں کو کہتے ہیں۔

[۵۳] سلم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کی کمیوں اور کمزوریوں کو پورا کر کے اسے (FULLEST DEVELOPMENT) عطا کر دی جائے۔ یہی اسلام کا مقصود ہے۔

ایسا نظام جس میں

ولهم رزقهم فيها بكرة وعشيا (۱۹/۶۲)

ان کے لئے ہمیشہ کھلا رزق ہوگا (اس میں کسی کے لئے کمی نہیں ہوگی)۔

یہ ہے وہ جنت جو ارضی زندگی کو آسمانی مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے (تقویٰ) کا فطری نتیجہ (وراثت) ہوگی۔

تلك الجنة التي نورث من عبادنا من كان تقيا (۱۹/۶۳)

یہ ہے وہ جنت جو ہم اپنے بندوں میں سے انہیں عطا کریں گے جو تقویٰ شعار ہوں گے۔

لہٰذا قرآن کی رو سے اس نظام دین کے قیام کا امکان ہر وقت ہے جس کا لازمی نتیجہ اس قسم کی جنت کا قیام ہے جس میں ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور ثمر بار ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں گے۔

یہ ہیں وہ دو راہیں، جو مذہب کو چھوڑ کر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر مسلمان مزید ذلت و خواری سے بچنا چاہتا ہے تو اسے بہرحال "مذہب" چھوڑنا ہوگا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے خالص دنیا (قریبی مفاد) کی راہ اختیار کرنی ہے یا حال و مستقبل دونوں کی درخشندگی کی دینی راہ۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی اکثریت اپنی موجودہ پستی و زبوں حالی میں مگن ہے۔ وہ اپنی افیون کی پینک سے باہر آنا ہی نہیں چاہتی۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اقوام عالم کی دیکھا دیکھی اس پستی سے نکلنے کا احساس پیدا ہو رہا ہے لیکن چونکہ صحیح راہ ان کے بھی سامنے نہیں اس لئے وہ مذہب کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ امور دنیا کے ساتھ کچھ اخلاقی اصول اور کچھ مسلمانوں کے سابقہ ادوار حکومت کے تعزیری قوانین، اس طرح شامل کر لئے جائیں کہ ہماری حکومتیں، اسلامی حکومتیں بن جائیں چنانچہ ان کے سامنے

اسلامی حکومتوں کی پیوند سازی

اسلامی "حکومتوں" کا نقشہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ کا بھڑکیلا تمدن ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی پیوند سازی سے یہ نظام کبھی دینی نظام نہیں بن سکتا۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک بوتل میں بند کر دینے سے پانی نہیں بن جایا کرتا۔ اس امتزاج کے لئے ایک کیمیادی عمل کی ضرورت ہے اس عمل کیمیادی کے بغیر ایک ظاہری "اتحاد" تو پیدا ہو جاتا ہے، حقیقی ائتلاف[1] کہ جس کا نتیجہ ان عناصر کے طبعی خصائص میں یکسر قلب ماہیت پیدا کر کے، انہیں ایک نئے عنصر میں تبدیل کر دینا ہوتا ہے، کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ظاہری اور خارجی پیوند کا نتیجہ الٹا خسران ہوتا ہے۔ قرآن کفر خالص کو بھی نتیجہ خیز بتاتا ہے (اس سے قریبی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں) اور دین خالص کو بھی نتیجہ خیز (جس میں حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جاتے ہیں) لیکن وہ "کفر اور دین" کی اس قسم کی امتزاجی کوشش کو نیم صداقت یعنی منافقت قرار دیتا ہے جس میں کوئی کوشش بھی بار آور نہیں ہوتی۔ سورہ بقرہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پیشتر درج کی جا چکی ہے۔ بات واضح ہو جائے گی۔

افتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض. فما جزاء من يفعل ذالك منكم الا خزي في الحياة الدنيا ويوم القيامة يردون الى اشد العذاب (۲/۸۵)

کیا تم ایسی زندگی اختیار کر رہے ہو جس میں قانون کی بعض شقوں کو اختیار کر لو اور اس کے دوسرے حصوں کو الگ رکھ دو

---

[1] قرآن اتحاد کے لئے ائتلاف کا تقاضا کرتا ہے (الف بین قلوبکم)۔ اتحاد دو اجزا کا محض ایک جگہ جمع ہو جانا ہے۔ ائتلاف ان کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا کہ بایں نمط کہ وہ ایک بھی ہو جائیں اور اپنی انفرادیت بھی نہ کھوئیں۔ بلکہ وہ ایک ہوتے ہی اپنی انفرادیت کو مستحکم کرنے کے لئے ہیں۔

یاد رکھو! جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کریگی اس کی اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ اسے حال کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی نصیب ہوگی اور اس کے بعد بھی سزا ملے گی۔

قرآن دین کے نظام کو خالصتہً اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ "شتر مرغی" انداز سے نہیں۔ فاعبد واللہ مخلصین لہ الدین (۳۹/۲)

یہ ہے میرے نزدیک صحیح راہ عمل۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے بہت کم لوگ اس کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے (تاوقتیکہ وہ اس کا مطالعہ خالی الذہن نہ کریں) اور جو اسے سمجھ سکیں گے ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے اندر آمادگی پائیں گے۔ نہ سمجھ سکنا اس لئے کہ مذہب اپنے اعتقادات و رسوم کو اس قدر مقدس بنا رکھتا ہے کہ انسان اس کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی ملحد سے باتیں کیجئے تو وہ کم از کم عقلی دلائل تو سنے گا، لیکن مذہب پرست گروہ عقل کو پاس تک نہیں پھٹکنے دے گا۔ اور جو کچھ اس کے پاس تقلیدی وراثت سے پہنچ چکا ہے، اسے کسی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے قطعاً تیار نہیں ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

افمن زین لہ سوء عملہ فرآہ حسنًا فان اللہ یضل من یشاء ویھدی من یشاء (۳۵/۸)

جس کا برا عمل اس کے لئے خوش گوار بن جائے اور اسے نہایت حسین دکھائی دے۔ کیا وہ بھی کبھی سیدھے راستہ پر آسکتا ہے؟ یہ ہے وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق گمراہی اور ہدایت کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

جو بات کو غلط سمجھے اس کے راہ راست پر آجانے کی توقع ہوتی ہے لیکن جو سے سمجھے ہی بالکل صحیح تو وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ اسی لئے رسول اللہ کو ارشاد ہوا کہ فلا تذھب نفسک علیھم حسرات (۳۵/۸) "سو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو چکی ہو انہیں راہ راست پر لانے کی فکر میں تو اپنی جان کو کیوں ہلاک کرتا ہے"؟

اور سمجھ جانے کے بعد عمل کرنا اس لئے دشوار ہوتا ہے کہ اس راہ میں ایسے ایسے معبود (اندادًا من دون اللہ) کھڑے ہوتے ہیں جن کا خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا کسی خلیل اکبر ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ مذہب کی راہ ایسی تن آسانی کی راہ ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دین کی پیہم سعی و عمل کی راہ اختیار کرنا، لوہے کے چنے چبانا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ دین کی مخالفت ہمیشہ مترفین (تن آسان لوگوں) کی طرف سے ہوتی۔ مجھے ان تمام باتوں کا احساس ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجھے میری قرآنی بصیرت نے جس نقطہ تک پہنچایا ہے میں نے اسے کاغذ پر محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے کہ آج نہیں تو آنے والی نسلوں میں شاید کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔ اگر اس وقت کوئی قرآن پر غور کرنے والا اسی راستے چل نکلا تو اسے میرے پاؤں کے نشانات دیکھ کر کم از کم اتنا اطمینان تو ہوگا کہ اس راہ سے اس سے پہلے کوئی اور بھی گذرا ہے

اور اگر میرے مخاطبین میں ایسے ارباب فکر و نظر موجود ہیں جو میرے ان نتائج فکر قرآنی سے متفق ہیں، تو مجھے اس کی بڑی مسرت ہوگی، اگر وہ مجھے اس سے مطلع فرمائیں، کیونکہ دنیا میں جو رشتہ قرآنی فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی سے پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ محکم و رشتہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے اس رابطہ باہمی سے ہم اس مسئلہ پر مزید غور و فکر سے، راستہ کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا کر سکیں اور اس طرح قرآنی بصیرت کی شمع عالمتاب سے ان پردوں کو اٹھا سکیں جو ہزار برس کی تقلیدی تاریکیوں اور مذہبی ظلمتوں سے اس پر پڑے ہوئے ہیں (لیخرج الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور) میرا ایمان ہے (اور میرے تجربہ نے اس ایمان کو مشہود کر کے دکھا دیا ہے) کہ جب تک ہم خالص

قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے، دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کرسکتے جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا اور جسے ہر وقت پیدا کرنے کی قوت وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ طریق کار ہے جو قرآن کی حامل قوم کے ذریعے ساری انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کردے گا۔ وہ انقلاب جس میں دنیا یہ حقیقت عملاً سامنے دیکھ لے گی کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

[یہ مقالہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت جنوری۔ فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد محترم پرویز صاحب کو اس ضمن میں بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ ان میں سے بعض اہم سوالات کے جوابات طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے جو مندرجہ صدر مقالہ کے بعض مقامات کی تشریح کرتے ہیں۔ ذیل میں ان سوالات اور جوابات کو بھی درج کردیا جاتا ہے تاکہ اس مقالہ کی تکمیل ہوجائے۔ طلوع اسلام]

سوال (۱) آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کی روحانی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ اسلام کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے؟

جواب۔ انسان کی معاشی ضروریات سے مراد صرف روٹی کپڑا نہیں بلکہ وہ تمام اسباب وذرائع ہیں جن سے انسان کے مضمر جوہروں کو کامل نشوونما کا موقع ملے یعنی انسان کے اندر جسقدر عمدہ صلاحیتیں ہیں ان تمام صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور برومند ہونے کے لئے مواقع میسر ہوں اور اس کے بعد ان صلاحیتوں کو ربوبیتِ عامہ کیلئے ایک نظام کے تابع استعمال کیا جائے۔ معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور میرے نزدیک اسلام کا یہی منشا ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آرا، محیر العقول اور قابلِ فخر وناز ہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کردے۔ اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطۂ زمین یا انسانوں کے کسی ایک گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا دائرہ عمل ونفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو؟ علاوہ بریں اگر خالص "معاشیات" کے نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروفِ سعی وعمل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار دراصل غمازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلق اس تصور کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے جس کی رو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے تقاضے کوئی ایسی شے نہیں جس کی طرف نسبت سے ہم جھینپے جھینپے محسوس کریں۔ عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی تھوڑی تھوڑی تک مادی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے۔ اور زبان سے ہم میں ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدائی نعمتیں قرار دیتا ہے۔ اسی کے نزدیک معاشی خوشگواریوں کا حصول قابلِ نفرت نہیں بلکہ قابلِ نفرت وہ نظام ہے جو ایسی معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا بیشتر حصہ اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رہ جاتا ہے چہ جائیکہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب وذرائع ہر قدم پر موجود پائے۔ قرآن کے نزدیک حسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز (یعنی ناہموار) معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ فرمائیے کہ جس نظام کا مقصود ومنتہا یہ ہو کیا آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد بقاواستحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور "روحانیت" بھی ہوسکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "ثواب" کی طرح "روحانیت" بھی

ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس لفظ سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بہت دور کی کوڑی لائیگا تو کسی بزرگ کی کرامات گنا دیگا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان "کرامات" سے کہیں بڑھ کر محیر العقول "کرامات" ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لہذا اگر اسلامی تعلیم کا مغز اور منتہیٰ اس قسم کے محیر العقول واقعات ہیں اور اسی کا نام "روحانیت" ہے تو اس میں اسلام کی کیا خصوصیت ہے۔ یہ تو غیر مسلموں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ یاد رکھئے قرآن نے کہیں بھی روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ "ربانی" بننے کا ہے۔ اس کے معنی ہیں نشوونما دینے والے نظام کے اہلین۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظام عدل و احسان اس قدر "روحانیت پرور" ماحول پیدا کر دے گا جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے برومند ہونے کے مواقع یکساں طور پر موجود پائے گا۔ یہی وہ ماحول ہو گا جس میں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی" یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمین عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

جسے تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے وہ کوئی چیستان نہیں کہ بغیر "علم لدنی" کے کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن (اور عربی زبان) کی رو سے تزکیہ کے معنی ہیں، بڑھنا، پھولنا، پھلنا، برومند ہونا جسے (DEVELOPMENT) یا (GROWTH) کہتے ہیں۔ اور نفس کے معنی ہیں انسانی صلاحیتیں۔ لہذا تزکیۂ نفس کے معنی ہوئے انسانی صلاحیتوں کا نشوونما پانا۔ اسی کا نام ربوبیت ہے۔ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما، انسانی معاشرہ سے الگ ہو کر زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کے چلوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے عین انسانی معاشرہ کے اندر۔ معاشرتی زندگی میں انسان کے سامنے نت نئے دن، نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے آتے رہتے ہیں۔ انسانی صلاحیتیں ان تقاضوں کے حل اور ان موانع کے ہٹانے سے جلا پاتی ہیں اور اسی طریق سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کی صلاحیتیں کس قدر نشوونما پا چکی ہیں۔ محمد رسول اللہ والذین معہ نے اسی قسم کا معاشرہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے چلہ کشی اور نفس کشی سے اپنی "روحانیت" نہیں بڑھائی تھی۔ "روحانیت" بڑھانے کا وہ طریقہ جسے تصوف "مغز دین" بتاتا ہے عجمی تصور کی پیداوار اور "مذہب" کی ایجاد ہے۔ دین انفرادی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی سکھانے کو آیا تھا۔ لہذا دین کے نظام میں (جسے معاشرتی کہہ لیجئے یا معاشی) صحیح "روحانیت" بڑھنے کا راز پوشیدہ ہے۔ میں اس نظام کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہوں۔

سوال ۲: آپ نے لکھا ہے کہ

(۱) جو قوم اپنی کوششوں کو کائنات کے قانون سے ہم آہنگ کرتی ہے اس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں اور

(۲) اور جو قوم صرف اپنے لئے نہیں بلکہ آنیوالی نسلوں کے لئے سوچتی ہے اس کی "آخرت" بہتر ہو جاتی ہے۔

یورپ کی قومیں تسخیر فطرت بھی کر رہی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے غلبہ و تسلط کی فکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ تو کیا آپ بھی علامہ مشرقی کی طرح یورپ کی اقوام کو بہترین مومن قرار دیتے ہیں؟

جواب ۲: جی نہیں! میں یورپ کی اقوام کو "مومن" قرار نہیں دیتا۔ اگر آپ میرے مضمون کے دوسرے مقامات کو بھی ساتھ ملا کر دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ میں نے اقوام یورپ کے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ

گروہ اول: وہ لوگ ہیں جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انہیں پیش پا افتادہ مفاد

حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ ان کے سامنے مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوع انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں، نیز وہ زندگی کو فقط طبیعی زندگی مانتے ہیں جس کا سلسلہ سانس بند ہو جانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔

اس سے ذرا آگے چل کر لکھا ہے:

بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو مذہب چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک ان کے عنان گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوام عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ میں یورپ کی اقوام کو مومن اور متقی قرار نہیں دیتا بلکہ ان کا شمار ان میں کرتا ہوں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو ان کے پیش نظر نوع انسانی کا مشترکہ مفاد نہیں بلکہ اپنی اپنی گروہ بندیوں کا مفاد ہے اور دوسرے وہ ظہور نتائج اعمال کے لئے حیات بعد الممات کے قائل نہیں جس کی وجہ سے وہ انسان کی موجودہ زندگی کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قسم کا متوازی معاشی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظام صرف وہ قوم قائم کر سکتی ہے جو زندگی کو طول اور عرض دونوں میں غیر منقطع تسلیم کرے۔ اور یہ تصور صرف قرآن دیتا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی کوششوں کو کائناتی قوانین سے ہم آہنگ کرے گا اس کی کوششیں نتیجہ خیز اور بار آور ہوں گی۔ پانی کے لئے قانونِ کائنات یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جو کسان اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کا کھیت سیراب ہوگا۔ جو پانی کی سطح سے اونچا بنائے گا پانی از خود وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا یہی طریق کر جو قوم تسخیر فطرت کرے گی اس کی کوششیں بار آور ہوں گی۔ اقوام مغرب اس نہج سے مسلمانوں سے آگے ہیں کہ وہ فطرت کے دبے ہوئے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکال رہی ہیں اور ان سے دھڑا دھڑ متمتع ہو رہی ہیں۔ انہیں مفادِ عاجلہ (دنیاوی نعماء) نصیب ہیں۔ ہم ان سے محروم ہیں۔ صرف اس حد تک ان کی کوششیں کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہیں۔ ہماری کوششیں اتنی بھی ہم آہنگ نہیں۔

جنہیں مفاد عاجلہ نصیب نہیں، زندگی اور اس کی حرارتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سمجھنا فریب نفس ہے کہ اگر مفاد عاجلہ نصیب نہیں تو نہ ہوں، ہماری آخرت تو خوشگوار ہے!

جنہیں مفاد عاجلہ میسر ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو صرف مفادِ عاجلہ ہی کو مقصود زندگی سمجھتے ہیں اور انسانیت اور خود زندگی کے مستقبل سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس غیر متوازن نظام زندگی کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی بساط آج ہر طرف بچھ رہی ہے۔ ان کا حال روشن ہے۔ لیکن مستقبل تاریک۔ یہ بہرحال ان سے بہتر ہیں جن کا حال تاریک ہے یعنی جن کی قسمت میں "امروز" نہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مفاد عاجلہ کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ انسانیت اور زندگی کے مستقبل پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ یہ وہ ... حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی تابناک۔ یہ گروہ پہلے گروہ سے بہتر ہے جس کا صرف حال ہی روشن ہے۔ یہ ہے وہ گروہ جو اس قسم کے متوازی معاشی نظام کے قیام کا کفیل ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ نظام صرف اسی گروہ کے ہاتھوں قیام پذیر ہو سکتا ہے جو وحدت انسانیت اور وحدت حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن اس نظام کے قیام کا عملی طریقہ بتاتا ہے جس کا نام تقویٰ ہے، یعنی مفاد عاجلہ کے لئے اپنی

کوششوں کو قانونِ کائنات سے ہم آہنگ کرنا اور کوششوں کے ماحصل کو مستقل اقدار (وحی) سے ہم آہنگ کرکے ایسے ماحول کا قیام جس میں انسانیت بڑھے، پھولے اور پھلے۔ لہٰذا اس نظام کا قیام قرآنی ضابطے کے بغیر ناممکن ہے۔

سوال نمبر ۳: آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے۔ روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے ایک حد تک اس نظام کو قائم کرکے بھی دکھا دیا ہے۔ پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب نمبر ۳: اول تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں بہ حیثیتِ نظام بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے نظام کی بنیاد "مساواتِ شکم" پر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں نہ صرف روٹی کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے بلکہ ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور برومند ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع بھی میسر ہوتے ہیں۔

لیکن اصل فرق اس اساس و بنیاد کا ہے جس پر اشتراکیت اور اسلام اپنے اپنے نظام کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر (سلیم کے نام دو خطوط میں[1]) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصورِ حیات یکسر مادی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد تسلسلِ حیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی وحدتِ انسانیت کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جس کی بنا پر اشتراکیین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی میں بس اسی دنیا کی زندگی ہے اس لئے ان کے سامنے بجز عاجلہ کے سوا اور مفاد آہی نہیں سکتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بنا پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظامِ معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی قدر کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصور باہی نہیں پا سکتا۔ یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو کمیونزم کا میکانکی فلسفۂ زندگی اخلاقی اقدار کو مٹانے کا داعی ہے لیکن دوسری طرف وہ اپنی تحریک کے قیام کے لئے دلیل اور جواز خود اخلاقی نظام سے مستعار مانگتا ہے، یاد رکھئے۔ میکانکی تصورِ حیات کا ماننے والا کبھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ "میں اپنی محنت کے ماحصل کو دوسرے کی بہبود کے لئے کیوں صرف کروں" اگر کوئی اس کا جواب دیتا ہے تو مجھے اس سے اطلاع دیجئے۔ لہٰذا اشتراکی نظام مادی نظریۂ حیات کے ماتحت یا تو ہنگامی جذبات کے ماتحت قائم کرایا جا سکتا ہے یا پھر استبداداً۔ اس وقت اشتراکی عوام کو یورپین اقوام کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بنا پر مشتعل کیا جاتا ہے اور یہی جذبہ ان کے اس "جنون" کا ذمہ دار ہے جو ان کی مساعی میں اس قدر گرمجوشی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے منفیانہ جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب یہ مشتعل گشتہ انتقامی جذبات فرو ہو جائیں گے تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ اُس وقت اس نظام کے اربابِ حل و عقد اپنی قیادت و سیادت، بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفظ اور بقا کی خاطر عوام سے اسی طرح اس نظام کے قیام کے لئے کام لیں گے جس طرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ، نچلے طبقے سے کام لیتا ہے۔ یاد رکھئے۔ کوئی نظام آئیڈیلوجی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور مادی نظریۂ حیات کوئی آئیڈیالوجی نہیں رکھتا۔

اس کے برعکس اسلام جس متوازن نظامِ ربوبیت کا قیام چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر رکھتا ہے (توحیدِ خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذ العمل ہے جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ، طبیعی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے)

---

[1] اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام کا فرق سمجھنے کے لئے ان "خطوط" کا مطالعہ بہت فائدہ بخش ہوگا۔ اس لئے ان خطوط کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے۔ اور اگر آپ کے پاس وہ پرچے نہ ہوں تو انہیں منگا لیجئے۔

اور زندگی کی اساس (BASE) ایک الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے اور مختلف افراد اس کے مظاہر ہیں۔ اس عقیدہ کی بنیادوں پر وہ ایک عملی پروگرام کی عمارت اٹھاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیر واقع ہوتا جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیر رونما ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت وجود کوش ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس طرح ایک دائرہ بن جاتا ہے جس سے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں میں ربوبیت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریق نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں گہر بن جاتا ہے۔ اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اس نظام کی اطاعت اکراہاً اور استبداداً نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ خود نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کھجور پک کر خود بخود شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے تو اس کی یہ کیفیت اطاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر "تربیت یافتہ نفس" (یعنی جس نفسِ انسانی کی نشوونما اس نظامِ ربوبیت کی رو سے ہوگی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہئے کہ اس کے قیام و استحکام کے لئے جدوجہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں ابلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے، نہ کہ محض روٹی کا حل، اور ایسا حل جو مقصود بالذات بن کر رہ جائے یعنی جب روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشوونما ارتقاء کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی سعی و عمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

یہاں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جو نظام تمام افرادِ معاشرہ کی جملہ ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی تمام انسانی صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرنے کا ضامن بنے گا اس میں رزق کے سرچشمے خود نظام کی تحویل میں ہونگے نہ کہ افراد کے قبضے میں۔

سوال نمبر ۴: آپ نے لکھا ہے کہ دین نے قیامِ صلوٰۃ کا حکم دیا تھا۔ مذہب میں یہ چیز نماز کی رسم ادا کرنے کے مرادف بن گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دین میں صلوٰۃ کی کوئی اور شکل ہوگی۔ وہ کونسی شکل ہوگی؟ آپ کس قسم کی نماز پڑھتے ہیں؟

جواب نمبر ۴: دین نے نظامِ ربوبیت کی تشکیل اور قیام کے لئے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ایک پروگرام مرتب کیا ہے، صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ اسی پروگرام کے اجزا ہیں۔ یہ پروگرام اس جماعت کی ساری زندگی کو محیط ہوتا ہے جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ کبھی غیر مرئی شکل میں جب اس کی روح اس جماعت کی سانس بن جاتی ہے اور کبھی مرئی اور محسوس صورت میں۔ اس پروگرام کی مرئی اور محسوس صورت کا نام "ارکانِ دین" ہیں۔ مذہب میں ان کی یہ مرئی اور محسوس صورت تو قائم رہتی ہے لیکن محض ایک رسم بن کر جس کا تعلق زندگی اور اس کے حوالی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب یہ ارکان نظامِ ربوبیت کو متشکل کر رہے ہوں تو یہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور جب یہ محض رسمی طور پر ادا کئے جاتے ہوں تو ان کے متعلق تصور کر لیا جاتا ہے کہ یہ "انفرادی نجاتِ آخروی" کا موجب ہیں۔ یہ ہے مفہوم میرے اس بیان کا کہ دین میں اقامتِ صلوٰۃ، محض نماز پڑھنے تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ مؤقت فریضہ صلوٰۃ، اس نظامِ صلوٰۃ کے اندر آجاتا ہے لیکن اس نظام سے الگ ہٹ کر اس کا کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ دین، قوانینِ خداوندی کی اطاعت سکھاتا ہے۔ مذہب پوجا پاٹ کی تعلیم دیتا ہے۔ فلہٰذا سوال شکل و صورت کا نہیں، نتائج کا ہے۔ ان ارکان کی شکل و صورت تو دین میں بھی یہی رہے گی لیکن اسوقت یہ دین کی زندہ اور متحرک مشینری کے پرزے ہونے کی جہت سے تابندہ نتائج کے حامل ہوں گے۔ آج یہ پرزے اس مشینری کے اندر فٹ ہونے کے بجائے الگ الگ پڑے ہیں۔ اس لئے کوئی نتیجہ پیدا

نہیں کر رہے۔ یہ ارکان کس طرح نظام ربوبیت کی تشکیل و بقا کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ارکان کا فطری اور یقینی نتیجہ اس نظام ربوبیت کا قیام ہے جس میں نوعِ انسانی توازن بدوش معاشرتی و معاشی نظم و ترتیب کی سازگار فضاؤں میں اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہو جائے گی۔ یوم یقوم الناس لرب العالمین۔

لہٰذا میرا یا کسی اور کا، کسی اور شکل و صورت کی نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی اسی شکل و صورت کی نماز پڑھتا ہوں جس کی اور مسلمان پڑھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے آپ یہ دھوکہ نہیں دیتا کہ قرآن کا مقصود یہی صلوٰۃ ہے جسکا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

اس مقام پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جب تم سمجھتے ہو کہ قرآن کا مقصود اس قسم کی بے روح نماز نہیں تو پھر تم نماز پڑھتے ہی کیوں ہو؟ اوّل تو اس لئے کہ قیام صلوٰۃ (یعنی دین کی صلوٰۃ کا قیام ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک اجتماعی پروگرام ہے۔ لہٰذا جب تک اس رسمی نماز کی جگہ حقیقی صلوٰۃ کے قیام کا امکان نظر نہیں آتا، میں بھی باقی قوم کے ساتھ چلے جا رہا ہوں کہ بالآخر میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ البتہ میں اس امید کے سہارے یہ کچھ کرتا ہوں کہ جس وقت بھی ہمارے مقدر کا ستارہ پلٹا تو دین کے نظام ربوبیت کے لئے ان ہی بے جان ڈھانچوں میں روح پھونکی جائے گی کہ قیامت نفخِ صور ہی سے بپا ہو گی۔ میں اسلام کے مستقبل سے نا امید نہیں ہوں۔ بلکہ دنیا کا مستقبل اسی کے ساتھ وابستہ سمجھتا ہوں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۱ء باب المراسلات)

اس میں شبہ نہیں کہ میں اس پروگرام کی ان جزئیات کو جو قرآن نے متعین نہیں کیں، غیر متبدل نہیں سمجھتا لیکن ان میں تغیر و تبدل کا حق بھی کسی فرد کو نہیں۔ نہ مجھے نہ کسی اور کو۔ اس کا حق اس مرکز ملت کو ہو گا جو قرآن کے مطابق نظام قایم کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ اس کی تفصیل بھی میرے مضمون "اسلامی نظام" میں آچکی ہے[1]

سوال ۵۔ آپ نے لکھا ہے کہ مذہب نے ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا (یا ملوکیت نے مذہب کے ساتھ مفاہمت کر لی) کیا اس سے آپ کی یہ مراد ہے کہ بزرگان مذہب نے عمداً اور دانستہ ملوکیت کو تقویت دینے کے لئے اس قسم کا سمجھوتہ کر لیا؟ پھر آپ نے لکھا ہے کہ اس سمجھوتے میں روایات، فقہ اور تصوف نے ملوکیت کو بڑی مدد دی۔ کیا یہ چیزیں اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟

جواب ۵: میں نے نہ تو ملوکیت کے ضمن میں کسی بادشاہ کا نام لیا، نہ مذہب کی سمت کسی بزرگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا مقصود افراد نہیں، بلکہ وہ نتیجہ ہے جس تک ہمیں تاریخ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے اسلاف کے متعلق میرا وہی مسلک ہے جو قرآن نے ہر مسلمان کے لئے متعین فرمایا ہے کہ اخواننا الذین سبقونا بالایمان (کہ وہ ہمارے بھائی ہیں جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہو گئے۔ ملوکیت اور مذہب دو (INSTITUTIONS) ہیں اور میری تنقید ان انسٹی ٹیوشنز ہی سے متعلق ہے۔ نہ کہ افراد سے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس نے دانستہ کیا کچھ کیا اور نادانستہ کیا کچھ، سو اس کا فیصلہ خدا کر سکتا ہے۔ ہم اس امر کیلئے جج بننے پر مکلف نہیں۔ اس باب میں بھی میرا مسلک وہی ہے جسے قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے مکالمہ کے ضمن میں فرمایا ہے کہ جب فرعون نے کہا کہ فما بال القرون الاولیٰ (اے موسیٰ یہ کہو کہ اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ علمہا عند ربی فی کتاب (کہ ان کا علم اللہ کے ہاں ان کے نامۂ اعمال میں ہے)۔ بزرگان کرام میں سے جس کسی نے دین کی کوئی خدمت کی ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں، لیکن تاریخ کی یہ حقیقت

---

[1] یہ مضمون بھی بڑا اہم ہے اور ہمارا ارادہ ہے کہ اسے بھی دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ (طلوع اسلام)

ہمارے سامنے ہے کہ جس نظامِ دینی کو محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا، بعد میں وہ ثنویت میں تبدیل ہوگیا اور مذہب اور حکومت انسانی زندگی کے دو مستقل دوائرِ عمل قرار پاگئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس طرح ہوا اور کن کے ہاتھوں سے، نہ ہی یہ کہ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ۔ دانستہ ہو یا نادانستہ نتیجہ ایک سا ہی مرتب ہوتا ہے۔ کوئی ماں اگر اپنے بچے کو نادانستہ دوائی کی جگہ زہر کی پڑیا دیدے تو اس کا نتیجہ بھی اسی طرح موت ہوتا ہے جس طرح دانستہ زہر دینے کا نتیجہ۔ ہم آج اس زہر کو اس لئے تریاق نہیں کہہ سکتے کہ اسے نادانستہ دیا گیا تھا۔ جتنی جلدی اس زہر کو زہر کہہ دیا جاتا بہتر تھا تاکہ آنے والے بچے اس سے ہلاک نہ ہوتے، اور اگر اسے اس وقت تک زہر نہیں کہا گیا تو کسی وقت تو اس کی ابتدا ہونی چاہیئے۔ اب ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک یقینی معیار موجود ہے جو زہر کو زہر اور تریاق کو تریاق بتا دیتا ہے تو ہم اس پڑیا کو کیوں نہ پرکھ کر دیکھ لیں کہ زہر ہے یا تریاق۔

باقی رہا یہ کہ کیا روایات، فقہ وغیرہ اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟ سو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان کا مقصد کچھ اور تھا لیکن انھیں اس نئے مقصد کے لئے استعمال کیا گیا، اور اس استعمال کے لئے پہلے یہ کیا گیا کہ انھیں ان کے اصل مقام سے ہٹا کر ایک نئی حیثیت دیدی گئی۔ ان کی یہ نئی حیثیت اس خرابی کا اصل موجب ہے اور جب تک انھیں ان کی اصلی حیثیت نہیں دی جائے گی یہ خرابی بدستور قائم رہے گی۔ دین کے غیر متبدل اصول قرآن کے اندر ہیں، ان کی جزئیات اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق امتِ محمدیہ نے خود متعین کرنی تھیں۔ دین کی اصلی سند قرآن تھا، اس لئے اسے یقینی طور پر محفوظ رکھا گیا۔ باقی چیزیں وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے تھیں، اس لئے انھیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صحابہ کرام میں جب تک ان چیزوں کو یہی حیثیت دی جاتی رہی ان سے نفع ہی نفع برآمد ہوا، خرابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں آنے والوں نے ان روایات کو اس لئے اکٹھا کیا کہ ان سے اس عہد ہمایوں کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ یہ تھا جمع وتدوینِ روایات کا جذبہ محرکہ اور یہ تھا ان روایات سے مقصود، لیکن بعد میں جب ملوکیت کو اپنے مقام کے لئے مقدس سہاروں کی ضرورت پڑی تو انھیں اس کی جستجو ہوئی کہ یہ سہارے کہاں سے مل سکیں گے۔ قرآن سے یہ سہارے مل نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ قرآن کا ہر حرف اپنی اصلی شکل میں محفوظ تھا جس میں نہ کسی تبدیلی کی گنجائش تھی نہ اضافے کا امکان۔ اگر کوئی شخص قال اللہ تعالیٰ کہہ کر ایک لفظ بھی ایسا اپنی زبان پر لاتا جو قرآن میں نہیں تھا تو ہزاروں ہاتھ اس زبان کو پکڑنے کے لئے بیک وقت اٹھ آتے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ قرآن میں نہیں ہے، اس پر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان سہاروں کے لئے کسی دوسری طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ گوشہ وہی ہو سکتا تھا جو قرآن کی طرح محفوظ نہیں تھا اور جس میں ہر قسم کے ردوبدل اور تحریف والحاق کی گنجائش تھی۔ یہ روایات کا مجموعہ تھا۔ جھوٹی روایات وضع کرنے میں کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ لیکن اگر روایات کو محض تاریخ ہی قرار دیا جاتا تو ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان روایات کو دین قرار دیدیا گیا بالکل قرآن جیسا دین (مثلہٗ معہٗ) بلکہ اس سے بڑھ کر کیونکہ روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی گئیں اور اس پر قاضی بھی۔ جب روایات کی حیثیت تاریخ دین سے خود دین میں تبدیل کر دی گئی تو پھر جس چیز کو چاہا دین بنا دیا۔ روایات سازی کی صدہا کامیاب کوششوں کا ذکر کتب جرح وتعدیل میں موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی کوششیں ایسی بھی ہوں گی جنھیں احتساب کی نگاہیں پکڑ نہیں سکیں۔ ان دانستہ کوششوں کے علاوہ، جو کچھ نادانستہ اور بڑی نیک نیتی سے ہوا وہ بھی اپنی مقدار اور مضرت رساں نتائج کے اعتبار سے کچھ کم نہیں تھا۔ جب بھی ظنیات کو یقین کا درجہ دے دیا جائے، یہ کچھ ہونا لازمی ہے۔

جو کچھ روایات کے بارے میں ہوا وہی کچھ فقہ کے ساتھ ہوا۔ فقہ ان جزئیات کا نام تھا جو ارباب تفقہ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے وقت میں نافذ العمل ہونے کے لئے مدون کی تھیں یا یوں سمجھئے کہ یہ ان فیصلوں کا نام تھا جو مسلمان بادشاہوں کے وقت ان کی عدالتوں سے صادر ہوتے رہے۔ جب وہ زمانہ گذر گیا تو ان جزئیات کی حیثیت بھی تاریخ کی

حیثیت دے گئی یعنی یہ بتانے کے لئے کہ فلاں زمانے میں فلاں اصول کو یوں نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان فقہی جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دے کر دین بنا دیا گیا — قرآن جیسا دین — اور جس طرح روایات میں جو جی میں آیا اسے رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا گیا اسی طرح فقہ کے متعلق بھی جو مناسب سمجھا گیا کسی امام فقہ کے نام سے مشہور کر دیا اس طرح یہ چیز بھی ملوکیت کی تقویت کا ذریعہ بن گئی۔

باقی رہا عجمی تصوف تو اس کا تو تصوری اسلام میں ایک اختراع تھی۔ اگر تصوف نام ہے اعمال میں اخلاص کا تو اس کے لئے نہ کسی جداگانہ اصطلاح کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ اسے کہ وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو منافقت کہلاتا ہے یا بے معنی رسم۔ عمل با اخلاص ہی ان نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو قرآن نے اعمال صالح کے پرکھنے کے لئے واضح الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں تاکہ اس باب میں کسی کے لئے کوئی غلط فہمی، کوئی دھوکہ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہو۔ لیکن تصوف نے اس ثنویت کو سند الوہیت عطا کر دی جو دین اور دنیا میں دوئی کا باعث بنی تھی اور جس سے ملوکیت نے اپنی زندگی پائی تھی۔ قرآن نے عیسائیت کے متعلق کہا تھا کہ اس میں رہبانیت کو بطور ایک بدعت اختیار کیا گیا لیکن وہ اس بدعت کو بھی نباہ نہ سکے۔ اس لئے کہ انسانی جذبات کو دبانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان جذبات کو دوسری سمتوں کی طرف منتقل کر کے انھیں مفید نتائج کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ رہبانیت انھیں دبانے کی کوشش کر کے انھیں مختلف زمین دوز راہوں سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے مذہب اسی قسم کے غیر فطری دبا ؤ کی زندگی سکھاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے جذبات کا Perversion جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے میں نہیں کہتا کہ ہماری کتب روایات و فقہ میں اس قسم کے Perversion سے متعلق جتنا لٹریچر ملتا ہے وہ ان حضرات کا پیدا کردہ یا جمع کردہ ہے جنھوں نے روایات یا فقہ کی پہلے پہل جمع و تدوین کی۔ نہ معلوم اس لٹریچر میں کہاں کہاں کی چیزیں آکر شامل ہو گئیں اور کن راہوں سے یہ سانپ حریم کعبہ میں آگھسے۔ لیکن جب ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ کعبہ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے تو کیا ہم اسے محض اس لئے باہر نہ پھینکیں کہ یہ سانپ غلافِ کعبہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے؟ وقت ہے کہ ہم حریم کعبہ کو اس قسم کے بتوں سے پاک و صاف کریں۔ ان بتوں کی کعبہ میں باریابی نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصود رسالت نہ بزرگان دین کے پیش نظر تھی، نہ مجتہدین ملت کا مدعا۔ ہماری بدبختی سے انھوں نے کسی نہ کسی طرح وہاں تک راہ پالی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان سانپوں کو کچل کر باہر پھینکدیا جائے یا اپنی عقیدتمندیوں کا دودھ پلا پلا کر ان کی پرورش کی جائے۔

(یہ تھے وہ سوالات اور جوابات جو "اسباب زوال امت" کے سلسلے میں طلوع اسلام بابت ماہ جون ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے تھے۔ آپ ان تفاصیل کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر اصل مضمون کو پڑھئے کیونکہ وہ مضمون بار بار پڑھنے اور سمجھنے کا ہے۔ طلوع اسلام)

کیا آپ نے المیزان کے حصے خریدنے کی اطلاع دیدی ہے؟
اگر نہیں دی تو جلدی کیجئے۔

نقد و نظر

PRAYER FOR PROGRESS

مصنف عبدالرزاق صاحب۔ سٹاکسٹ: محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

تحریک پاکستان میں مسلمان بڑی بے تکلفی سے نعرے لگایا کرتے تھے کہ پاکستان میں قرآنی آئین کا نفاذ ہوگا۔ ہر کہ دمہ اس نعرے میں برابر کا شریک تھا۔ تمام وابستگان تحریک متفق اللسان تھے کہ پاکستان کی سرزمین پاک کو نظام خداوندی کی تجربہ گاہ بنائیں گے۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا اور شاید کسی کو سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ قرآنی نظام کہتے کسے ہیں اور وہ نافذ کیسے ہوگا۔ لیکن جب پاکستان قائم ہوگیا تو ان نعروں کی صدائے بازگشت اس تقاضے کی صورت میں سنائی دینے لگی کہ اگر جانتے ہو تو بتاؤ کہ اسلامی نظام ہو کیا؟ آج قریباً ساڑھے چار سال کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن مسلمان اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ یہی وجہ ہے آج تک پاکستان کا آئین مرتب نہیں ہو سکا اور بظاہر یہ عقدہ لاینحل ہی نظر آ رہا ہے۔ تاریخ میں شاید ہی ایسی کوئی اور مثال ملتی ہو کہ کوئی تحریک حصول مقصد میں کامیاب ہو کر بھی نہ طے کر سکے کہ وہ مقصد تھا کیا جس کے لئے یہ کامیابی ہوئی ہے؟ مسلمانوں کی صورت یہ ہے کہ

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا،

ارباب اقتدار جو قرآنی آئین کی تنفیذ کے نعرے لگانے میں سب سے پیش پیش تھے اس سطح سے بلند نہ ہو سکے۔ انھوں نے پہلو بدل بدل کر یہ نعرے لگانا شروع کر دیئے کہ پاکستان کا آئین "اسلامک سوشلزم" پر استوار ہوگا۔ چنانچہ جہاں جہاں بھی وہ گئے انھوں نے اسی کو دہرایا۔ جب مرحوم لیاقت علی خاں امریکہ کے دورے پر گئے ہیں تو انھوں نے خصوصیت سے اس کا چرچا کیا کہ پاکستان میں اسلامک سوشلزم پر مبنی نظام نافذ العمل ہوگا۔ اس سے قدرتی طور پر دیگر ممالک میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اسلامک سوشلزم ہے کیا اور اس کا دیا ہوا آئین دنیا کے مروج آئینوں سے کیسے مختلف اور بہتر اور برتر ہے۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ چند امریکی پروفیسر کراچی آئے تو انھوں نے چند چیدہ چیدہ مسلمانوں سے ایک پبلک محفل میں یہ پوچھ ہی لیا کہ ذرا آپ اسلامک سوشلزم کے اصولوں کی وضاحت کر دیجئے۔ اس کے جواب میں انھیں یہ کہا گیا تھا کہ ہنوز اس آئین کا سراغ نہیں دیا جا سکا کیونکہ ابھی اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔

اس سوال کا جواب کچھ ہی کیوں نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے اٹھتے بیٹھتے یہ کچھ کہتے رہنے سے ممالک یورپ میں یہ تجسس پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامک سوشلزم کی ماہیت دریافت کریں چنانچہ ایسی کتابوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے جو بیرونی ممالک کو تحریک پاکستان کی غرض و غایت یا پاکستان کے نصب العین۔ یعنی اسلام۔ سے روشناس کرائیں یہ وقت تھا کہ اگر حکومت پاکستان اسلامی آئین مرتب نہیں کر سکی تو کم از کم مسلمان مفکر آگے بڑھتے اور فکر اسلامی کو از سر نو مرتب کر کے حالات حاضرہ کی روشنی میں اقوام عالم کے سامنے پیش کرتے تاکہ وہ اسلام کے نظام کو سامنے رکھ کر اپنے مروج آئینوں سے اس کا تقابل کر کے اسلام کی برتری کی معترف ہو جاتیں۔ لیکن مسلمان کہ خود اس کا دامن فکر و تدبر سے

نہی تھا، دیگر اقوام کی کیا راہبری کر سکتا تھا۔ وہ خود راہ گم کردہ تھا، ہزار سال کی روایات میں کھویا ہوا، زندگی سے دور، زندگی کے ہنگاموں سے دور۔ ان میں کے فقیہان اسلام "لغت ہائے حجازی کے بوجھ میں دبے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔ انھیں اپنی خبر نہ تھی، وہ کسی کے حالات و کوائف کیا سمجھتے۔ یوں بھی پھسڈی ملا کے لئے بیسویں صدی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن ملا بھی لات و منات کی طرح بھیس بدلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے ایک نئی نوع کو آگے بڑھایا ہے جس کا خمیر یکسر ملائیت سے اٹھایا گیا تھا لیکن انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی تعلیم حاصل کر کے "ماڈرن" بن چکی تھی۔ یہ طبقہ اس سے پیشتر اپنی تعلیم کا ماحصل انگریزی کی راہ پر نثار کرتا رہا تھا لیکن اب اس طبقے کے لئے نیا میدان کھل گیا کہ اسلام، ان کے لئے آسان موضوع اور مشغلہ موجود تھا۔ انھوں نے اشہب قلم سنبھالے اور شہسوار بن گئے چنانچہ اس دوران میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ متعدد کتابیں ایسی شائع ہو چکی ہیں جن میں وہی ملا کی دقیانوسیت انگریزی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ بلند آہنگ عنوانوں کیساتھ۔

اس میدان کے نئے شہسوار جناب عبدالرزاق صاحب بی اے ہیں آپ مشرقی پاکستان کی سول سروس کے رکن ہیں اور آپ کی انگریزی تصنیف کا نام ہے PRAYER- For Progress کتاب کا ضمنی عنوان ہے "شریعت کی روشنی میں عبادت الٰہی کی معقول توجیہ" ابتدا ہی میں آپ نے یہ سوال اٹھائے ہیں کہ کیا عبادت کا جذبہ طبعی ہے؟ اس کا جواب وہ بڑی آسانی سے یہ دیتے ہیں کہ عبادت انسان کی جبلت میں داخل ہے۔ کیسے؟ جواب سن لیجئے کیا آپ پر یاس و کرب کی ایسی گھڑی نہیں گذری کہ آپ نے دل ہی دل میں اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہو اور اللہ سے نجات کی دعا مانگی ہو؟ ایسا خوشی کے خاص موقعوں پر بھی ہوتا ہے جب انسان "بے اختیار" ہو کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیا یہ قطعی ثبوت نہیں کہ عبادت جبلت میں داخل ہے؟ دراصل عبادت کا جذبہ انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ یہ جذبہ کائنات کی فطرت میں بھی ودیعت کر دیا گیا ہے۔ دونوں عبادت کرتے ہیں یا دونوں کو کرنی چاہیئے انسان کو (بے جان) کائنات سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسے انہماک سے عبادت میں مصروف ہے! کتاب بالعموم اسی قسم کے "استدلات" سے بھری پڑی ہے۔ مصنف کے چند مفروضات ہیں جنھیں وہ بزعم خود عقلی دلایل سے ثابت کرتے ہیں ثبوت عموماً یوں ہوتا کہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ یوں ہوتا ہے۔

گو کتاب کا موضوع تو یہ ہے کہ عبادت کا بہ حیثیت ذریعہ ترقی جائزہ لیا جائے لیکن فاضل مصنف نے جو کچھ اسلام کے متعلق سن رکھا ہے، اسے کسی نہ کسی طریق سے ضرور نوک قلم پر لے آئے ہیں۔ اسلام کے ساتھ آپ نے سائنس اور فلسفہ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ اور بزعم خود انھیں غلط ثابت کیا ہے۔ مثلاً دوسرے باب میں کائنات کی تخلیق و مقصد پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ مادہ میں توانائی ہے لیکن

> یہ توانائی کہاں سے آئی؟ ہم یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ مادہ کسی سرچشمہ سے توانائی حاصل کرتا ہے لیکن ہم یہ سمجھ نہیں سکتے کہ توانائی مادے کا خاصہ ہے۔ یہاں سے مادہ پرست اور خدا پرست کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ اول الذکر اسے مادہ کی خاصیت متصور کرتا ہے اور آخر الذکر کا عقیدہ ہے کہ توانائی اللہ کی طرف سے ہے۔

مصنف نے قدرے تعلّی سے دعویٰ باندھا ہے کہ انھیں سائنس اور فلسفہ کی غیر مانوس وادیوں میں سرگرداں و جادہ پیما رہنا پڑا کیونکہ موضوع کی وضاحت کے لئے ایسا ناگزیر تھا لیکن مصنف کے طرز بحث اور انداز استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کی حد، دور حاضرہ کی معلومات سے بہت پیچھے ہے۔ گو یہاں اس بحث کی کوئی گنجائش نہیں لیکن عہد حاضرہ کی تحقیقات جس مقام پر پہنچ چکی ہیں وہاں مادہ اور توانائی کی وہ

ثنویت ختم ہو چکی ہے جسے مصنف نے مدارِ بحث بنا کر استنباطِ نتائج کیا ہے۔ کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کر کے آپ اس قدرتی سوال کو سامنے لاتے ہیں کہ اس تخلیق کا مقصد بالآخر کیا ہے؟ اور ایک ہی فقرے میں بلا بحث یہ جواب دیکر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "خالق رحمٰن" کی فطرت کا تقاضا تخلیق ہے۔ عقیدتمندوں کی محفل میں بیٹھ کر تو یہ "مسکت" جواب دیا جا سکتا ہے لیکن سائنس و فلسفہ کا ذکر چھیڑ کر اتنا جواب دیکر پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ مگر اسی ایک بات ہی پر کیا موقوف ہے، مصنف نے کہیں دلیل و بیان کی ضرورت نہیں سمجھی، اور جسے انھوں نے بزعم خود دلائل کہا ہے وہ ایسی ہی لاطائل بحثیں ہیں۔

ارتقاء کے نظریہ پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ڈارون کے نظریہ کی تغلیط کی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ کسی بوزنے نے انسان کا بچہ جنا ہو؟ اب کون کہے کہ صاحب میں نے دیکھا ہے۔ جب کوئی کہنے کے لئے آگے نہیں بڑھتا تو لامحالہ صاحب کتاب یہ نتیجہ نکالیں گے کہ ارتقاء کا نظریہ سراسر غلط ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اسلامی' نظریہ مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ (انسان کیا دوسری تمام نوعیں دیسی کی دیسی پیدا ہوئیں۔ کسی میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا۔) انسان کی روح جنت میں پہلے ہی سے رکھی پڑی تھی (البتہ وہ عبادت میں مصروف تھی) اسے وہاں سے اٹھا کر اس مجلس آب و گل میں مقید کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا جہاں آدم اور حوا کی اولاد چلی۔ کیسے؟ یہ تاریخ کی داستان ہے، جسے مصنف نے نظر انداز کر دیا ہے۔

انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اسے حیوانات سے یوں ممتاز کیا کہ اسے حسِ ششم یعنی ضمیر عطا کی۔ یہ حس یعنی ضمیر انسان کو 'ذاتِ غیب' کا ادراک عطا کرتی ہے تاکہ انسان راہِ راست سے بھٹک نہ جائے۔ اللہ انسان کو ضمیر کے واسطے سے متنبہ کرتا رہتا ہے اور خیر اور شر سے آگاہ رکھتا ہے۔ اگر ضمیر کا یہ مقام ہے اور وہ واقعی خدا کے پیغام براہِ راست رسول کرتی ہے اور انسان کو آگاہ و متنبہ کرتی ہے تو خدا نے نبی کیوں بھیجے؟ علیحدہ علیحدہ کتابیں کیوں نازل کیں؟ اور قرآن کو کیوں قیامت تک محفوظ رکھا؟ یہ سوالات ایسے ہیں جنھیں مصنف نے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مصنف کے نزدیک اللہ اور ضمیر کے درمیان کیا کچھ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ انسان کے ضمیر اور نفس میں پیہم جنگ رہتی ہے۔ اللہ عموماً اس جنگ میں مداخلت نہیں کرتا (بلکہ وہ غیر جانبدار رہتا ہے) کیونکہ اس نے فریقین کو اس انداز سے تیار کر رکھا ہے کہ آخر کار ضمیر کی فتح مقدر ہے۔ اگر انسان ضمیر کو کامیاب بنانے میں ناکام رہتا ہے تو وہ اس کا قصور ہے، اللہ کا نہیں ("اللہ کا اس میں کوئی قصور نہیں" یہ الفاظ مصنف نے کئی جگہ دہرائے ہیں۔ اللہ کو اس قسم کا وکیل شاید ہی کبھی میسر آیا ہوگا۔) ذرا آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ اللہ کو انسانی روح کی حقیقی فلاح مقصود ہے اس لئے وہ ضمیر اور نفس کی جنگ میں کبھی کبھی مداخلت کر بھی گذرتا ہے۔ مداخلت کے وقت وہ "درد کی ہیمر" استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ پیغمبر بھیجتا ہے جو اذیتیں ۔۔۔ درد ۔۔۔ اٹھا کر انسان کے لئے مثال قائم کرتے ہیں۔ اس قسم کی مغلق گفتار کے بعد آپ حسنِ استنباط کا یوں مظاہرہ کرتے ہیں لہٰذا انسان اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے۔

مصنف کا یہ بھی ارشاد ہے کہ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ انھیں جنت میں داخل کرے۔ اس غرض کے لئے وہ اپنے بندوں کو اس دنیا میں انعامات بھی دیتا ہے لیکن اگر سارے کا سارا انعام یہیں دیدے تو جنت میں اس کے پاس دینے

کے لئے کیا رہ جائے۔ اس لئے وہ انعام میں سے کچھ کاٹ کر جنت معمور کرتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ بھی تو مصیبت ہے کہ اگر بندوں کو پورے انعام واکرام میسر آجائیں تو وہ ان کی لذتوں میں کھو جائیں گے اور پاک اور صاف نہیں رہیں گے۔ اگر کوئی کہدے کہ یہ مصائب جاں گسل ہیں تو ان کو مصنف یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ مصائب یقیناً جہنم کی سزا کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ گویا انسان کا انتخاب دنیاوی مصائب اور جہنم کے عذاب میں ہے۔ اب بتائیے مشرقی پاکستان کے اس رکن سول سروس میں اور ملّا میں اس کے سوا اور کیا فرق باقی رہ جاتا ہے کہ وہ دنیا کو عربی زبان میں 'دارالمحن' کہتا ہے اور یہ انگریزی میں۔ وہ "قدامت پسند" ہے اور یہ "ماڈرن"۔

انسان کی دنیاوی زندگی پر بحث کرتے ہوئے آپ انسانی عمر کا ذکر کرتے ہیں اور اس مروجہ خیال کی کہ انسان کی عمر قلیل ہے، یوں تردید کرتے ہیں کہ انسان کی دنیاوی زندگی آخرت کی تیاری ہے اور اس کی حیثیت ثانوی ہے لہٰذا اسے مختصر ہی ہونا چاہئے۔ اور پھر انسان کو دیکھئے کہ وہ دولت کماتا ہے تو، بھوکا رہتا ہے تو، تسخیرِ فطرت کرتا ہے تو ہر حال میں ناخوش رہتا ہے جب اس کی زندگی کا انداز یہ ہے تو لمبی عمر یعنی چہ!

ایک باب "انسان، اس کے مسائل اور ان کا حل" سے مختص ہے۔ کتنا دلکش عنوان ہے، اور جو مصنف سائنس اور فلسفہ کے نظریات بھی کھنگال چکا ہے، وہ کتنی دلچسپ بحث کرے گا! لیکن بحث کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نے اس دنیا میں گناہ کی زندگی اختیار کی جس سے اس کے لئے طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ گو مصنف نے اس سے بالفاظ صریح یہ ثابت نہیں کیا اگر انسان گناہ نہ کرے تو اس کیلئے کوئی مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو لیکن جسد کتاب میں لرزش خفی بالکل اسی قسم کی ہے۔ اس 'اسلام' اور عیسائیت کی رہبانیت میں کیا فرق ہے؟ اسے خود مصنف بھی سمجھ نہیں سکے ہوں گے، چہ جائیکہ وہ کسی اور کو سمجھائیں۔

مصنف فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نیکوکاروں کو اذیتیں پہنچاتا ہے تو انھیں پاک وصاف کرنے کی نیت سے ایسا کرتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گناہگاروں پر عنایات واکرام کیوں؟ اس کی وجہ بھی صاف ہے۔ گناہگاروں کو جنت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اللہ ان کو پاک وصاف کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لہٰذا وہ ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ وہ مہربان ہے اس لئے وہ انھیں خوشحال رکھتا ہے۔ یہ اللہ بھی عجیب اللہ ہے۔ وہ گناہگاروں کو خوش حال رکھے تو مہربان کہلائے اور نیکوکاروں کو مصائب میں مبتلا رکھے تو مہربان کہلائے!

مصنف کے طرزِ استدلال کی ایک اور دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔ موت کا ڈر دور کرنے کے خیال سے آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موت تکلیف دہ مرحلہ نہیں۔ چنانچہ پہلے تو آپ یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب کوئی انسان مر کر واپس نہیں آیا تو یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ مرنے والے کو اذیت ہوتی ہے۔ اس کی تقویت کے لئے وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ایک مرض میں ان کی حالت نازک ہو گئی اور آپ مر مر کے بچے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب میں بیہوش تھا تو اگر میں اس حالت میں مر جاتا تو مجھے اس بے ہوشی کی وجہ سے موت کی مفروضہ اذیت کا احساس بھی نہ ہوتا۔ شاید اس تجربہ کی بنا پر آپ نے ایک کلیہ بیان کیا ہے کہ موت سے پیشتر ہوش بجا نہیں رہتا (لہٰذا اذیت نہیں ہوتی) یا اگر ہوش باقی رہے تو موت ایسی ناگہانی واقع ہوتی ہے کہ اذیت کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اس کلیہ کے لئے آپ کے پاس سند کیا ہے؟

یہ کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن سند کس کس بات کی طلب کی جائے۔ یہاں تو کسی بات کی بھی سند نہیں۔ مصنف سند سے بہت اونچے ہیں۔

موت کا ڈر دور کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ عبادت ہے۔ نیز یہ دلیل بھی کہ روح غیر فانی ہے جو موت سے نہیں مرتی۔ لیکن روح کے غیر فانی ہونے کی دلیل کیا ہے؟ دلیل یہ کہ تمام مذاہب اس کی تعلیم دیتے ہیں اور بیشتر انسان اسے تسلیم کرتے ہیں! اور سند کیا چاہیئے؟

ایک باب میں ترقی کے لوازمات گنوائے گئے ہیں اور ارکان خمسہ کی حکمتوں کو اس طرح ثابت کیا گیا ہے کہ ملّا بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ نماز کا ہر رکن ناقابل تغیر ہے۔ اذان کی انسانی آواز بھی "غیر متبدل" عنصر ہے۔ نماز روح کی ورزش ہے اور امور دنیا سے علیحدگی کا ایک ذریعہ بھی۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسے سمجھنا بھی چاہیئے لیکن (اس سمجھنے سے کہیں) زیادہ ضروری خشوع ہے جو نماز میں پیدا ہونا چاہیئے۔ جو لوگ نماز کے الفاظ کے معانی نہیں سمجھتے وہ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ وہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس سے قرآنی الفاظ میں خطاب کر رہے ہیں۔ "حضور" پیدا کرنے کے لئے یہی احساس کافی ہونا چاہیئے۔

پھر ارشاد ہے کہ نماز معاشری ادارہ نہیں جو لوگ نماز کو معاشری ضرورت یا مصلحت سمجھتے ہیں وہ نماز کو اس کے بلند ترین مقام سے پست ترین درجہ میں لے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ نماز کو اجتماعی فعل سمجھنا تو ایک طرف لائق مصنف آخری باب میں شریعت کے نکتہ چینوں اور شریعت میں اصلاح کے خواہاں لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ خوش قسمتی سے شریعت میں اصلاح پسندی ابھی تحریک کی صورت اختیار نہیں کر سکی۔ اس اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ توجہ کا مرکز روحانیت سے ہٹا کر انسانی اجتماع (معاشرت) کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ لیکن اگر قوم روحانیت سے ہٹ گئی تو مذہب ختم ہو جائیگا (یہاں ہم مصنف سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ یہ رائے ان کی سو فیصدی صحیح ہے۔ بس ایک مرتبہ اس روحانیت کا پردہ چاک ہو جائے تو مذہب ــ دین نہیں، مذہب ــ خود بخود ختم ہو جائے گا)

الغرض کہاں تک تبصرہ کیا جائے کتاب کے ایک ایک صفحے پر حکمت و مذہب کے موتی بکھرے پڑے ہیں جن احباب میں ان موتیوں کو چننے کی ہمت ہے وہ کتاب دیکھیں۔ مصنف نے کتاب لکھنے میں جس قدر مطالعہ کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام سے متعلق کتاب ہے اور ساری کتاب میں صرف ایک مرتبہ اقبال کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ اس نے پاکستان کا تصور دیا ہے۔ ہمارے اس دور میں یہ ذکر بھی اتفاق سے ہو گیا ہے۔ کیونکہ مصنف نے خواہ مخواہ پاکستان کا ذکر کر دیا جس کے ضمن میں قائداعظم اور اقبال کا نام لینا ناگزیر ہو گیا۔ جس شخص کا اقبال سے تعارف صرف اسقدر ہو وہ اسلام پر جس قسم کی کتاب لکھ سکتا ہے ظاہر ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہر چند مصنف نے کتاب کا عنوان عبادت۔ تجویز کیا، لیکن جو کچھ اسلام کے متعلق سنا سنایا یاد تھا وہ سب کچھ انھوں نے جیسے جی میں آیا لکھ دیا اور اس میں ربط کی ناکام کوشش کہیں کہیں اس میں عبادت کا ذکر کر کے کی۔ یہ کتاب تفنن طبع کا وافر سامان اپنے اندر رکھتی ہے لیکن اس کا المناک پہلو یہ ہے کہ یہ انگریزی میں لکھی گئی ہے اور اسے جب بیرونی ممالک پڑھا جائے گا تو باہر والے اسے سند تسلیم کریں گے اور اسلام کے متعلق وہ رائے قائم کریں گے جو مصنف نے پیش کی ہے۔ اگر یہ کتاب پرانے ملا کی

لکھی ہوئی ہوتی تو اور بات تھی کیونکہ اسے عام طور پر ملا کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اب یہ کتاب ایک تعلیم یافتہ — غیر مُلّا — کی تصنیف کردہ ہے۔ جس نے محنت اور مطالعہ سے یہ طومار جمع کیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں دنیا بھر میں جس طرح اسلام کو ذلیل و رسوا کریں گی اس کا اندازہ فی الحال نہیں ہو سکے گا۔ لیکن ابھی ایسی کتابوں کو شائع ہو کر چار دانگ عالم میں نشر ہونے دیجئے اور چند سالوں میں آپ دیکھئے گا کہ خود مسلمانوں کی محنت سے اسلام کی راہ میں توہین و استہزاء کے کس قسم کے ہمالیہ پہاڑ حائل ہو جائیں گے۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک — سر برآور و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اسلام مصنف کے نزدیک قرآن اور حدیث کا مجموعہ ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں آپ کے نزدیک غیر متبدل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت انسانی ہر دور میں اور ہر جگہ یکساں ہے۔ سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

غضب خدا کا، ایک شخص معمولی حساب کی کتاب لکھتا ہے تو لوگ دیکھتے ہیں کہ اس فن میں اس کا درک کہاں تک ہے۔ لیکن یہاں ایک شخص اٹھتا ہے اور اس کی جہالت کے نشتر سے نہ خدا محفوظ رہتا ہے، نہ رسول، نہ قرآن، نہ اسلام، لیکن اس سے کوئی بازپرس نہیں کرتا؟

کتاب پر قیمت درج نہیں۔ البتہ کاغذ اتنا موٹا لگایا گیا ہے کہ یہ دو سو صفحات کی کتاب دوگنے حجم کی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔

ربِ اسلام یہ ۲۷ صفحات کا ایک پمفلٹ ہے جسے شیخ محمد انور صاحب کاشمیری نے لکھا ہے اور ادارۂ تربیتِ ذہنی پشاور نے شائع کیا ہے۔ (قیمت اس کی ۲ ؍ فی نسخہ ہے)۔ مصنف کے الفاظ میں یہ مقالہ درحقیقت ان کی ایک تصنیف "فکرِ معاش" کا ایک باب ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے دیگر ابواب میں، ایک باب "اسلام کا قانونِ اساسی" ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "اسلام کا قانونِ اساسی صرف قرآن ہے۔" آخری باب "ملکیت زمین" ہے جس میں "اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ از روئے قرآن زمینداری قطعاً حرام ہے۔ بلکہ قرآن کا زرعی نقطۂ نظر یہ ہے کہ صرف اتنی زمین ہی کسی شخص (کاشتکار) کی ملکیت ہو سکتی ہے جسے وہ خود کاشت کر سکے اور جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہو۔"

ہمیں اس سے پہلے شیخ محمد انور صاحب کی کسی تحریر کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن انہوں نے اپنی غیر شائع شدہ تصنیف کے ابواب کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اصولی طور پر آپ کا مسلک وہی ہے جس کا نقیب طلوعِ اسلام ہے۔ اس سے ہمیں خوشی ہوئی کہ اب طلوعِ اسلام بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

میرے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں

قرآن کے معاشی نظام کا پورا پورا نقشہ محترم مصنف کے ذہن میں کیا ہے اس کا اندازہ تو ان کی تصنیف (فکرِ معاش) سے کے

دیکھنے ہی سے لگ سکے گا۔ لیکن زیرِ نظر مقالہ سے اتنا اندازہ ضرور لگ سکتا ہے کہ آپ کی فکر قرآنی ہے۔ اگرچہ اس میں ہنوز پختگی نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اسی نہج پر قرآن میں غور و تدبر کرتے رہے تو قرآن کی بہت سی راہیں اور واضح اور کشادہ ہو کر ان کے سامنے آتی جائیں گی۔ ہم اپنے ہم فکر مصنف سے درخواست کریں گے کہ قرآن کے معاشی نظام کے متعلق طلوعِ اسلام میں جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے وہ اس پر بھی غور کریں۔ ممکن ہے اس سے ان پر بعض ایسے مقامات واضح ہو جائیں جن کے متعلق محسوس ہوتا ہے کہ انہیں کچھ ذہنی الجھاؤ ہے۔

احکام الہدیٰ فی حقیقت الہویٰ

یہ کتاب کا نام ہے اور اس کا عرف ہے "قرآن اور حقیقتِ شرک"۔ کتاب کا عمود یہ ہے کہ مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل کہ وہ انفرادی طور پر نماز، روزہ وغیرہ کی پابندی کرتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر قانونِ شریعت کو پسِ پشت ڈال دیتے، منافقت اور شرک کی زندگی ہے۔ حقیقی توحید یہ ہے کہ انسان کی پوری کی پوری زندگی قانونِ شریعت کے تابع ہو۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مصنفِ کتاب (داعی حق و صداقت حافظ محمد سرور صاحب) کا دل مسلمانوں کی بداعمالیوں کو دیکھ دیکھ کر سخت مجروح ہو چکا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی اصلاح ہو جائے۔ یہ جذبات نہایت نیک اور یہ آرزوئیں بڑی مقدس ہیں لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

جو شخص اس سوال کا عملی حل بتا سکے اسی کا درد نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

کتاب کی ضخامت ۵۲۲ صفحات۔ کتابت اور کاغذ اچھا۔ قیمت مجلد ۔/۸/۵۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ اسلامیہ ۱۰۷ سی خدا داد کالونی۔ کراچی ۵

سو شعر

مرتبہ محمود علی خاں صاحب جامعی۔ شائع کردہ مکتبۂ شاہد کراچی۔ قیمت چھ آنے۔

ہمارے سکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور عام قارئین اردو شعرائے متقدمین کے کلام سے اکثر ناآشنا رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مطالعہ کے لئے انھیں مناسب راہنمائی نہیں ملتی اور دوسرے ان شعرا کے ایسے انتخاب موجود نہیں ہیں جنھیں بآسانی دیکھ سکیں۔ ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی میں "انتخاب" بجائے خود ایک صنف بن گیا ہے۔ وہاں مشہور کتابوں کے ایسے ایسے انتخابات مرتب کئے گئے ہیں کہ وہ بجائے خود تصانیف معلوم ہوتے ہیں۔ اردو میں ابھی کسی گوشے کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی تو انتخاب کی فکر و کاوش کون کرتا!

ہندوستان میں جامعہ ملیہ نے اپنے تعلیمی ضروریات کے پیش نظر "سو شعروں" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ طلبہ کیلئے

ضرور مفید تھا، اور اس کی افادیت اسی حد تک ہو سکتی تھی، کیونکہ ضخیم دیوانوں میں صرف ایک شعر نکال لینے سے آخر کہاں تک پورے کلام کا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ انتخاب بہرحال جامع ہونا چاہئے۔ بعینہٖ یہی سلسلہ کراچی سے بھی شروع کیا گیا ہے۔ یہ اسی پرانی لکیر کی فقیری ہے۔ اس میں کوئی جدت نہیں، نہ کمی و بیشی ہے۔ تاہم یہ تقلیدی اشاعت بھی غنیمت ہے کیونکہ یہ پاکستان کے طلبہ کے کام آ سکتی ہے۔

اس وقت تک غالب، درد، میر، مومن، فانی، اکبر، حسرت اور اصغر گونڈوی کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ ہر انتخاب کے ساتھ شاعر کا مختصر تعارف شامل کر کے اس سلسلہ کو اور مفید بنا دیا گیا ہے۔

انتخابات کی افادیت مسلم ہے اور اردو میں ان کی ضرورت اشد ہے۔ لیکن کرنے کا کام یہ ہے کہ ضروری کتابوں اور دیوانوں کے ایسے انتخابات شائع کئے جائیں جو ان کتابوں کا صحیح آئینہ ہوں اور اپنے اندر تشنگی نہ رکھتے ہوں۔ یہ کام بجائے خود محنت و کاوش اور ذوق کا متقاضی ہے۔ جو ہمارے ہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

معاملہ کی باتیں

۱۔ طلوع اسلام ہر مہینے باقاعدگی سے جملہ خریداروں کے نام بھیجدیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو پرچہ نہ ملے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈاک میں گم ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں ادارہ سے متعلق بدظنی کرنے کی بجائے ادارہ کو اطلاع دیدیجئے کہ آپ کو پرچہ نہیں ملا تاکہ پرچہ دوبارہ بھیج دیا جائے۔

۲۔ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ یہ نمبر آپ کے پتے کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔

۳۔ چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرتے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ ضرور لکھئے۔

خوارج

علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "خوارج" عدم گنجائش کی وجہ سے شائع نہیں ہو اب آئندہ پرچے میں شائع ہوگا

گوجرانوالہ

میں طلوع اسلام کی تقسیم بشیر صحرائی (امرتسری) صاحب ریل بازار کے سپرد ہے

حقائق و عبر

عین بروقت ... حکومت پاکستان کے متعلق عام طور پر لوگوں کو شکایت ہے کہ وہ عام امور میں بروقت یا قبل از وقت فیصلے نہیں کرتی جس سے معاملات اور الجھ جاتے ہیں اور طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شکایت سابقہ معاملات میں صحیح ہو یا غلط کم از کم ایک تازہ معاملہ میں تو سو فیصدی غلط ہے۔ مصر اور سوڈان کا قضیہ کب سے الجھا چلا آرہا ہے۔ حال ہی میں شاہ فاروق نے اپنے "شاہ مصر و سوڈان" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا ایک اثر یہ ہوگا کہ غیر ملکی سفیر جو آئندہ مصر میں متعین ہوں گے انھیں اپنے کاغذات سفارت وغیرہ "شاہ مصر و سوڈان" کے حضور پیش کرنے ہوں گے۔ اس کا مطلب واضح الفاظ میں یہ ہوگا کہ ایسا کرنے والے شاہ فاروق کو شاہِ سوڈان بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی ممالک نے شاہِ فاروق کے نئے لقب کو تسلیم کر لیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اتفاق کی بات ہے کہ اس نئے لقب کا اعلان ایسے وقت میں ہوا جب پاکستانی سفیر جناب اسحٰق سیٹھ صاحب مصر سے سبکدوش ہو کر مراجعت فرمائے وطن ہو رہے تھے۔ چنانچہ فوراً یہ مسئلہ سامنے آیا کہ نیا وزیر متعین کرنے کی صورت میں نیا خطاب بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل اور سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ شاہ مصر کو شاہ مصر و سوڈان تسلیم کرتے ہیں تو مشکل۔ تسلیم نہیں کرتے تو مشکل۔ چپ رہا نہیں جا سکتا کیونکہ نیا سفیر بھیجنے کے ساتھ ہی مہر خاموشی توڑنی پڑتی ہے۔

اب دیکھئے کہ آپ کی حکومت نے اس لاینحل مسئلہ کا کیا آسان حل سوچ لیا۔ فوراً فیصلہ کر دیا کہ سیٹھ صاحب کو واپس مصر بھیجا ہی نہ جائے نہ نیا سفیر مقرر ہو نہ لب کشائی کی نوبت آئے۔

اس فیصلے پر نکتہ چینی بھی ہوئی لیکن حکومت کی مشکل ظاہر تھی۔ بالآخر سنا ہے کہ حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ نئے وزیر کے تقرر کے وقت شاہ فاروق کے نئے خطاب کو تسلیم کر لے گی۔ اب بحث کی صورت یہ ہے کہ کوئی نیا سفیر مقرر ہی نہ کیا جائے۔

اس پر بھی اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ حکومت اہم امور کے فیصلے بروقت نہیں کرتی تو آپ کا قصور فہم ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ شاہِ فاروق کے ہاں لڑکا دیر سے پیدا ہوا ورنہ حکومت بیچاری تو یہاں تک اعلان کر دیتی کہ جب نومولود حکمراں ہوگا تو حکومت اسے شاہ مصر و سوڈان تسلیم کر لے گی۔

۲۔ "شرعی" پارٹی اس حقیقت کے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں سے افرنگی تو چلا گیا ہے لیکن افرنگیت کا زور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے ان کاموں کے لئے افرنگیوں ہی کا انتخاب عمل میں آتا ہے جن کے متعلق خود افرنگی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا کہ انھیں ان کاموں کے لئے بھی چنا جا سکتا ہے۔ مثلاً دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دستور

کی تسوید کے لئے ایک خالص افرنگی ڈرافٹسمین، مجلس دستور ساز کے سکریٹریٹ میں مصروفِ خامہ فرسائی ہیں۔ ان کے بعد ایک اور صاحب بہادر کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہمارے قائداعظم (مرحوم و مغفور) کیسے تھے۔ غور فرمائیے! قائداعظم ہمارے اور ان کی سیرت نگاری کا کام ایک ایسے صاحب (MR. BOLITHO) کے سپرد کیا گیا ہے جسے عمر بھر ان سے ملنے تک کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ وہ خیر سے پاکستان میں تشریف فرما ہیں اور ہر "راہ رو" سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا قائداعظم کی کوئی بات تو سناتے جاؤ۔ کہتے ہیں کہ ان کی "محنتِ شاقہ" پر کوئی پچاس ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ اس کے بعد وہ قائداعظم کی سوانح حیات قلمبند فرمائیں گے اور کتاب ان کی اپنی ملکیت ہوگی!

بہرحال یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اصل بات اس سے آگے آتی ہے۔ لندن کے ایک اخبار کی اطلاع ہے کہ ان صاحب کو پاکستان کے پریس اتاشی مسٹر سلمان۔ اے۔ علی اور ان کی بیگم صاحبہ نے الوداعی پارٹی دی۔ جس میں پاکستان کے ہائی کمشنر متعینہ لندن اور ان کی بیگم صاحبہ، ڈپلومیٹک سٹاف کے ارکان، نامور ارباب قلم اور دیگر مشاہیر شریک تھے۔ جو صاحب اخبار مذکور کی یہ خبر پڑھ رہے تھے انھوں نے کہا کہ لکھا یہ ہے کہ سلمان صاحب نے بولیتھو صاحب کو "شرعی" پارٹی دی۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ "شرعی" پارٹی کا مفہوم کیا ہے۔ جب اخبار دیکھا تو اس میں لکھا تھا "SHERRY PARTY"

یعنی خالص شراب کی دعوت!

اسی "شرعی" پارٹی کی نسبت سے شاید مُلّا شیدا نے لکھا تھا کہ

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پروردگارے۔ عشق را پیغمبرے

شاہ جہاں کو اس شعر کی کیا قدر ہو سکتی تھی! نہ ہوئے شیدا صاحب آج زندہ جو اس کیف انگیز تصور کی داد پاتے!

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے نمائندو! خوش رہو۔

۳۔ اہم تبدیلی

حکومت پاکستان کے خلاف ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ اس نے ابھی تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنا عروۃ الوثقیٰ بنا رکھا ہے اس لئے پاکستان آزاد ہونے کے بعد بھی انگریز کا غلام ہے۔ یہ الزام بہت بڑا اتہام ہے۔ ہم تنقید کے خلاف نہیں، لیکن اتہام کو تو کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ خالص اتہام ہے کہ حکومتِ پاکستان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو علیٰ حالہٖ نافذ کر رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہنوز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی رائج ہے لیکن حکومتِ پاکستان نے اس میں ایسی ایسی اہم تبدیلیاں کر لی ہیں کہ ان سے سابقہ "غلامی" کی بہت سی شقیں آزادی میں بدل گئی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی شق ۲۶ میں لکھا تھا کہ کوئی شخص مجلس مقننہ کا ممبر نہیں بن سکتا اگر

(i) وہ فاتر العقل ہو۔

(ii) دیوالیہ ہو۔

(iii) دو سال یا اس سے زیادہ کی قید کا سزایاب ہو۔

(iv) انتخابات کے سلسلہ میں کسی ناجائز یا خلاف قانون کارروائی کا مرتکب ہوا ہو۔

اب اس ایکٹ کو اٹھا کر دیکھئے جسے حکومتِ پاکستان نے اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے۔ اس میں شق ۳۶ کے سامنے لکھا ہے ــــ "حذف کر دی گئی"۔ (OMITTED)۔ غور کیجئے اکس قدر اہم تبدیلی ہے؟ اب ہر فاتر العقل، ہر دیوالیہ، ہر سزایاب، یا الیکشن میں چار سو بیس کا مرتکب، دھڑلے سے ممبر بن سکتا ہے! اگر یہ آزادی نہیں تو اور کسے آزادی کہتے ہیں؟ آزادی نام ہے پابندیاں ہٹا دینے کا۔ انگریزوں نے محکوم قوم پر خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں کہ کوئی پاگل، کوئی دیوالیہ، کوئی مجرم، مجلسِ مقننہ کا ممبر منتخب نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا۔ ہم نے ان پابندیوں کو بیک جنبشِ قلم اٹھا دیا۔ سبحان اللہ! آزادی بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے!! اگر ہمیں آزادی نہ ملتی تو پاگلوں کو مجلسِ مقننہ کے بجائے پاگل خانوں میں بھیجنا پڑتا۔ دیوالیوں اور مجرموں کے لئے قید خانے بنوانے پڑتے۔ اب مسئلہ کیسا آسان ہو گیا؟

ہم بعض وقت سوچتے ہیں کہ اگر انگریز کا قانون علیٰ حالہ رہتا اور ہمیں اس میں تبدیلی کرنے کی آزادی نہ ملتی تو ہماری مجلس دستور ساز کی کتنی نشستیں خالی ہو جاتیں! کیا اب بھی تم خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کرو گے؟

۴۔ ساقی نامہ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ خلافت گاہِ کراچی میں شراب خانوں کی تعداد کتنی ہے؟ اس کا تو ہمیں علم نہیں۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے یہاں قریب ایک سو دس شراب خانے تھے اور اب "اللہ کے فضل سے" دو تین زیادہ ہی ہیں۔

ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

۵۔ نظریۂ اضافیت

ایک اور صاحب پوچھتے ہیں کہ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) سمجھنے کے لئے کونسی کتاب پڑھی جائے!

اب نظریۂ اضافیت سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی تشریف لے آئیے۔ چار دن میں بات سمجھ میں آجائے گی۔ ایک شخص عمر بھر آپ میں رہتا ہے۔ کسی کو اس کی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ اسے وزیر یا سفیر بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن دنیا بھر کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہو جاتی ہیں۔ چاروں طرف سے اس کی حمد و ستائش کے غلغلے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے تدبر و سیاست، فہم و فراست، علم و عقل، جہانبانی و جہاں بینی کے چرچے ساری فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

میاں تو ایک طرف، بیگم صاحبہ بھی مسائل سلطنت کی عقدہ کشائی میں نورجہاں، مہمات امور کے سر کرنے میں چاند بی بی اور فصاحت و طلاقت میں قرۃ العین سے کم دکھائی نہیں دیتیں۔ یہاں کسی انجمن کا افتتاح ہو رہا ہے۔ وہاں خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ کہیں کسی نئی کلب کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اخبارات کی پیشانیاں ان کی تصاویر سے مزین کی جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کہ اتنے میں میاں صاحب قلمدانِ وزارت یا کرسیٔ سفارت سے الگ ہو جاتے (یا کر دیئے جاتے) ہیں اور اس کے دوسرے ہی دن، ان دونوں کی خوبیاں غائب غُلّہ ہو جاتی ہیں اور یہ شہاب ثاقب پھر فضاؤں کی تیرگی میں کھو جاتے ہیں۔

اسے کہتے ہیں "اضافیت" یعنی جہاں ہر خوبی اور قابلیت اضافی ہو، ذاتی نہ ہو۔ مسند حکومت پر آ بیٹھے تو اس کی نسبت سے ساری خوبیاں جمع ہو گئیں۔ جہاں یہ نسبت الگ ہوئی، پھر نظام صاحب سقے کے سقے۔

حسنِ اتفاق

سے ہمارے پاس، علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہٗ کی سیرت الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) کے آٹھ نسخے آ گئے ہیں۔ تاریخ الامت قریب قریب نایاب ہو رہی ہے اس لئے ان چند نسخوں کی موجودگی مغتنمات میں سے ہے۔ قیمت فی -/۳/۸ علاوہ محصولڈاک ہے۔ جو آٹھ فرمائشیں سب سے پہلے موصول ہوں گی انھیں کتاب بھیجدی جائے گی۔

ناظم طلوع اسلام۔ کراچی

اطلاع

دسمبر ۱۹۵۱ء کے طلوع اسلام میں نصرت کتاب گھر کی طرف سے کتابوں کا ایک اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ شاید کتاب لمیٹڈ" بند ہو گئی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں "کتاب لمیٹڈ" کا باقاعدہ کام جاری ہے۔ "نصرت کتاب گھر" کا اس ادارے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

کتاب لمیٹڈ۔ رالسن روڈ۔ کراچی

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن۔ جلد چہارم)

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرور کائنات صلعم جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بیس روپے محصول ڈاک عہ/

نوادرات

(مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری)

بڑا سائز

ضخامت چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised & Nutritive Cooking Oil

High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robson Road, Karachi.